یکم اپریل ۲۰۲۶ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۹ ۔ شمارہ نمبر: ۷

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمود الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

امریکا کو جنگ کے نقصانات برسوں بھگتنے پڑیں گے!

'ہم قلت کی دنیا میں جی رہے ہیں'، یہ الفاظ امریکی نائب صدر جے ڈی وانس کے ہیں جو انہوں نے ۲۰۲۴ء میں میونخ سکیورٹی کانفرنس میں ادا کیے تھے۔

انہوں نے خبردار کیا تھا کہ امریکا کے پاس اتنے ہتھیار نہیں کہ وہ بیک وقت مشرقی یورپ، مشرقِ وسطیٰ اور ممکنہ طور پر مشرقی ایشیا میں جنگوں کا سامنا کر سکے۔

اب ان کے باس اور امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے ایران کے خلاف جنگ شروع کرنے کے بعد یہ خدشات حقیقت بنتے نظر آ رہے ہیں۔

اس جنگ نے امریکی فوج پر پہلے سے موجود دباؤ کو مزید بڑھا دیا ہے اور اس کی ایشیا میں کسی ممکنہ تنازع کے لیے تیاری بھی متاثر ہوئی ہے۔ ماہرین کے مطابق ایران کے خلاف امریکا کے 'آپریشن ایپک فیوری' کے اثرات کئی سال تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

ماہرین کے اندازوں کے مطابق امریکا نے جنگ کے ابتدائی چار دنوں میں ۵ ہزار سے زائد مختلف اقسام کے ہتھیار استعمال کیے جبکہ پہلے ۱۶ دنوں میں یہ تعداد تقریباً ۱۱ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس طرح یہ مہم جدید تاریخ کی سب سے شدید فضائی کارروائی بن گئی جس نے ۲۰۱۱ء میں لیبیا پر نیٹو کے حملوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

جب امریکا اور اسرائیل نے ایران کی فضائی دفاعی صلاحیت کو تباہ کر کے فضا پر کنٹرول حاصل کر لیا تو وہ اپنے اہداف کے قریب جا کر کم فاصلے والے سستے اور وافر بم استعمال کرنے لگے۔ امریکا کے پاس ایسی لاکھوں JDAM کٹس موجود ہیں جو عام بموں کو گائیڈڈ ہتھیاروں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

امریکی وزیرِ جنگ پیٹ ہیگسیتھ کے مطابق امریکا کے پاس ان کٹس کا تقریباً لامحدود ذخیرہ موجود ہے اور پینٹاگون کے اندازے کے مطابق جنگ کے ۲ ہفتے بعد استعمال ہونے والے ۹۹ فیصد ہتھیار اسی نوعیت کے تھے۔

تاہم اصل مسئلہ ان ہتھیاروں کا ہے جو جنگ کے ابتدائی دنوں میں استعمال ہوئے۔ ابتدائی چھ دنوں میں جب امریکی طیاروں کو فاصلے سے حملے کرنا پڑ رہے تھے، ایک ہزار سے زائد مہنگے اسٹینڈ آف ہتھیار استعمال کیے گئے۔ اس کے علاوہ درمیانے فاصلے کے میزائل اور ریڈار کو نشانہ بنانے والے میزائل بھی بڑی تعداد میں استعمال ہوئے جن کے ذخائر پہلے ہی محدود تھے۔

اس سے بھی بڑا مسئلہ فضائی دفاع کا ہے۔ ایران کے ابتدائی میزائل اور ڈرون حملوں سے امریکا اور اس کے اتحادیوں کے دفاعی میزائلوں کا بڑا حصہ استعمال ہو چکا ہے۔ صرف پہلے ہفتے میں امریکا نے تقریباً ۱۴۰ پیٹریاٹ اور ۱۵۰ سے زائد تھاڈ انٹرسیپٹر میزائل استعمال کیے جبکہ ان کا ذخیرہ پہلے ہی کم تھا۔

ماہرین کے مطابق 'ہر میزائل جو ہم آج استعمال کرتے ہیں، وہ ان میزائلوں میں سے ایک میزائل کم کر دیتا ہے جو کل یوکرین یا بحرالکاہل میں کام آ سکتا تھا'۔

ان ہتھیاروں کی دوبارہ تیاری میں برسوں لگ سکتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق صرف ابتدائی چار دنوں میں استعمال ہونے والے اسلحے کی جگہ نئے ہتھیار بنانے کی لاگت ۲۰ سے ۲۶ ارب ڈالر تک ہو سکتی ہے۔ مگر اصل مسئلہ صرف اخراجات نہیں بلکہ دستیابی کا ہے۔

مثال کے طور پر امریکا نے جنگ کے ابتدائی دنوں میں ۳۰۰ سے زائد ٹوماہاک کروز میزائل استعمال کیے جبکہ پینٹاگون نے پورے سال میں صرف ۵۷ نئے میزائل خریدنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اسی طرح تھاڈ انٹرسیپٹر میزائلوں کی ۲۰۲۳ء کے بعد کوئی نئی فراہمی نہیں ہوئی اور ۲۰۲۷ء تک صرف ۳۹ میزائل فراہم کیے جانے کا امکان ہے، وہ بھی آرڈر دینے کے چھ سال بعد۔

پینٹاگون نے ہتھیاروں کی پیداوار بڑھانے کے بڑے منصوبے پیش کیے ہیں۔ ان میں ٹوماہاک میزائلوں کی سالانہ پیداوار ۶۰ سے بڑھا کر ۱۰۰۰ تک لے جانا، اور ''پی اے سی۔۳ ایم ایس ای'' میزائلوں کی پیداوار ۶۰۰ سے بڑھا کر ۲۰۰۰ تک کرنا شامل ہے۔ تاہم امریکی کانگریس نے ابھی تک ان منصوبوں کے لیے مکمل فنڈز کی منظوری نہیں دی۔

مزید یہ کہ اسلحہ سازی کی سپلائی چین پیچیدہ اور سست روی کا شکار ہے۔ میزائلوں کے انجن بنانے کے لیے استعمال

اندرونی صفحات پر

- ایرانی قیادت پر حملے، مصنوعی ذہانت کا استعمال!
- ایران جنگ کا خاتمہ کیسے ہو؟
- علی لاریجانی کے جانشین کون ہیں؟
- آبنائے ہرمز کھلوانے کی جنگ کیسی ہوگی؟
- عالمی بالادستی کا بھارتی خواب!
- صرف 'ہرمز' عالمی تجارت کا نازک مقام نہیں!
- امریکا آخر چاہتا کیا ہے؟

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

ہونے والے کچھ کیمیائی مواد صرف ایک یا دو کمپنیوں سے دستیاب ہوتے ہیں اور ان کی فراہمی میں طویل وقت لگتا ہے۔

کچھ اہم اجزا ایسے معدنیات پر مشتمل ہیں جن پر چین کا کنٹرول ہے، جیسے گیلیم، نیوڈیمیم اور امونیم پرکلوریٹ۔ ماہرین کے مطابق 'کانگریس ایک رات میں اربوں ڈالر مختص تو کرسکتی ہے، مگر وہ ان معدنیات کو فوری طور پر پیدا نہیں کرسکتی'۔

دوسری جانب جنگ میں بہت کم طیارے یا ڈرون تباہ ہوئے ہیں مگر اصل مسئلہ فوجی ساز وسامان کے مسلسل استعمال اور خرابی کا ہے، خاص طور پر امریکی بحریہ کے لیے۔

امریکا کے پاس ۱۱ بڑے طیارہ بردار جہاز (ایئر کرافٹ کیریئر) ہیں مگر ایک وقت میں ان میں سے چند ہی فعال ہوتے ہیں۔ اس وقت 'یو ایس ایس ابراہام لنکن' اور 'یو ایس ایس جیرالڈ آر فورڈ' اس جنگ میں مصروف ہیں، جبکہ 'یو ایس ایس جارج ایچ ڈبلیو بش' بھی ممکنہ طور پر جنگ میں شامل ہونے جارہا ہے۔

'جیرالڈ آر فورڈ' تقریباً ۲۷۰ دنوں سے مسلسل سمندر میں موجود ہے اور جلد ہی ویتنام جنگ کے بعد سب سے طویل تعیناتی کا ریکارڈ توڑ سکتا ہے۔

اس دباؤ کے اثرات بھی سامنے آرہے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق اسی جہاز پر ۳۰ گھنٹے تک آگ لگی رہی جس کے باعث ۶۰۰ سے زائد اہلکاروں کو سونے کی جگہ نہیں مل سکی۔

ایک سابق پینٹاگون اہلکار کے مطابق 'یہ ایسا ہے جیسے آپ ایک گاڑی کو مہینوں تک ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلائیں اور کبھی انجن آئل نہ بدلیں'۔

ماہرین کے مطابق اس جنگ کی موجودہ رفتار کے باعث ایسے مواقع بھی آسکتے ہیں جب امریکا کچھ علاقوں میں طیارہ بردار جہاز تعینات ہی نہ کرسکے اور یہ صورتِ حال دو سے تین سال تک برقرار رہ سکتی ہے۔

فوجی اہلکار بھی شدید تھکن کا شکار ہورہے ہیں۔ طویل تعیناتیاں خاندانی دباؤ بڑھاتی ہیں، جو خودکشی جیسے سنگین مسائل کا سبب بن سکتی ہیں۔

تاہم کچھ ماہرین کے مطابق اس جنگ کے چند مثبت پہلو بھی ہیں۔ ایک سابق پینٹاگون اہلکار کے مطابق اس جنگ کے تین اہم فائدے سامنے آئے ہیں۔

پہلا، کم لاگت والے نئے ہتھیاروں کا استعمال، جیسے 'لوکاسٹ اَن مینڈ اٹیک سسٹم' (لوکاس) جو ایران کے شاہد ڈرونز کی طرز پر تیار کیا گیا ہے اور بڑے پیمانے پر جلد تیار کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا، امریکی فوج کو عملی جنگی تجربہ حاصل ہورہا ہے جو چین کے مقابلے میں ایک بڑی برتری سمجھی جاتی ہے۔

تیسرا، جدید مصنوعی ذہانت پر مبنی نظاموں کا استعمال جو اہداف کے تعین اور کمانڈ اینڈ کنٹرول جیسے امور میں پہلی بار بڑے پیمانے پر استعمال ہورہے ہیں۔

لیکن ماہرین اس بات پر متفق نہیں کہ یہ فوائد طویل مدتی نقصانات سے زیادہ اہم ہیں۔ درحقیقت نئی ٹیکنالوجی کی آزمائش اور جنگی حکمت عملیوں کا استعمال ایک خطرہ بھی بن سکتا ہے۔

ایک ماہر کے مطابق 'ہم اپنی حکمت عملی چین کے سامنے بے نقاب کررہے ہیں۔ اگر چین کو ہمارے طریقہ کار اور وقت کا اندازہ ہوگیا تو وہ اسے تائیوان پر ممکنہ حملے میں استعمال کرسکتا ہے'۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ٹرمپ انتظامیہ کے کئی افراد پہلے یہ مؤقف رکھتے تھے کہ امریکا کو مشرقِ وسطیٰ کی جنگوں سے نکل کر چین کے مقابلے پر توجہ دینی چاہیے۔

مگر اب ایران کی جنگ نے الٹا امریکا کے ایشیا میں موجود وسائل کو کمزور کردیا ہے۔ جاپان سے ایک میرین یونٹ کو ہٹا دیا گیا ہے جبکہ جنوبی کوریا سے تھاڈ دفاعی نظام کے کچھ حصے منتقل کیے گئے ہیں۔

ماہرین کے مطابق اس صورتِ حال کے اثرات طویل عرصے تک رہ سکتے ہیں اور حالیہ جنگ میں ہتھیاروں کے بڑے پیمانے پر استعمال اور میزائل دفاعی نظام کی کمزوری اس دہائی کے باقی حصے میں بحرالکاہل میں امریکی دفاعی صلاحیت کو متاثر کرسکتی ہے۔ (مترجم: بن فاروق)

"The Iran war could sap American military power for years". (" Economist". Mar 18, 2026)

بقیہ: ایران جنگ کا خاتمہ کیسے ہو؟

ایران کو اپنی سلامتی کے حوالے سے بہت سے خدشات لاحق ہیں۔ ایران کو کسی بھی حالت میں اس بات کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے کہ وہ اسرائیل کے وجود کے لیے خطرہ بنے۔ ایران اپنی مرضی کے مطابق فلسطین کے مسئلے کو بھی بروئے کار لاکر اسرائیل اور دیگر علاقائی ممالک کے لیے مشکلات پیدا کرسکتا ہے۔

ایران کو اپنی مرضی کی حکومت کے تحت زندہ رہنے کا حق ہے۔ امریکا یا اسرائیل کو اس بات کی پروا نہیں ہونی چاہیے کہ ایران میں کس کی حکومت ہے۔ اگر ایرانی عوام اپنی حکومت سے خوش اور مطمئن ہوں تو پھر کسی کو بھی کوئی فکر لاحق نہیں رہنی چاہیے۔

جب تک ایرانی قیادت اسرائیل اور فلسطین کے تنازع میں مداخلت سے گریز کرے اور اسرائیل کو دھمکیاں دینا بند رکھے تب تک امریکا کو چاہیے کہ ایرانی حکومت کو اُس کی طرزِ عمل کی بنیاد پر برتے نہ کہ نظریاتی طور پر۔

ایران کہیں نہیں جارہا۔ اور اسرائیل بھی وہیں رہے گا جہاں وہ ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں ایران کے تزویراتی مفادات ہیں۔ وہ عالمی سطح پر بہت کچھ کرتے رہنے کی ذہنیت بھی رکھتا ہے۔ لازم ہے کہ سب ایک دوسرے کو سمجھیں۔

امریکا نے اپنی مرضی سے جنگ شروع کی ہے اور اُسے ختم کرنا بھی امریکا کا اپنا فیصلہ ہوسکتا ہے۔ مطلوب مقاصد کے حصول کے بغیر جنگ ختم کی جاسکتی ہے تاکہ مزید خرابیوں کی راہ مسدود کی جاسکے۔ جنگ روکنا تمام فریقین کے مفاد میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہر فریق اِتنی دانائی کا حامل ہے کہ مزید خرابیوں کے پیدا ہونے سے پہلے اور کسی بہتر متبادل کا امکان ختم ہوجانے سے قبل جنگ کو روکنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Why the U.S. must focus on Iran end-of-war scenarios". ("The Globalist". March 20, 2026)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ مطبوعات

عورت
بدلتے مسلم معاشروں میں
مرزا محمد الیاس
قیمت: ۱۵۰۰ روپے

اَلقُدس
پس منظر اور صہیونی عزائم
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
قیمت: ۶۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

ایرانی قیادت پر حملے، مصنوعی ذہانت کا استعمال!

Greg Miller

اسرائیل نے ایران کی قیادت کو نشانہ بنانے کے لیے نئی مصنوعی ذہانت (اے آئی) ٹیکنالوجی کے ذریعے مہلک کارروائیاں تیز کر دی ہیں۔

امریکی اور اسرائیلی فوجی کمانڈر جب ایران کے خلاف جنگی حکمتِ عملی تیار کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تو انہوں نے مختلف اہداف، جن میں میزائل بیٹریاں، فوجی اڈّے اور جوہری تنصیبات شامل تھیں، پر حملوں کی ذمہ داریاں تقسیم کرنے پر غور کیا۔

تاہم ابتدا ہی سے یہ واضح تھا کہ ایران کی اعلیٰ قیادت کو تلاش اور ہلاک کرنے کا ایک نہایت حساس اور سنگین مشن اسرائیل کے حصے میں آئے گا۔

اسرائیل نے اس مشن کو غیر معمولی کارکردگی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ جنگ کے ابتدائی مرحلے میں ایران کے سپریم لیڈر کو قتل کر دیا گیا اور اسرائیلی فوج کے مطابق اب تک ۲۵۰ سے زائد سینئر ایرانی عہدیداروں کو نشانہ بنایا جا چکا ہے۔ تازہ ترین کارروائی میں اسرائیل نے ایرانی پاسدارانِ انقلاب کی بحریہ کے کمانڈر کو ہلاک کر دیا ہے۔

اعلیٰ قیادت کو قتل کرنے کی حکمتِ عملی ایک ایسے خفیہ نیٹ ورک پر مبنی ہے جسے اسرائیل نے دہائیوں میں تیار کیا مگر حالیہ برسوں میں اسے جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے مزید مؤثر بنایا گیا ہے۔ اسرائیلی فوج اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ حکام کے مطابق، اب یہ نظام پہلے سے کہیں زیادہ مہلک اور مؤثر ہو چکا ہے۔

ان حکام کے مطابق اسرائیل کو ایران کے اندر وسیع پیمانے پر معلوماتی ذرائع حاصل ہو چکے ہیں جن میں ایسے اندرونی افراد بھی شامل ہیں جو اسرائیل کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہزاروں ڈیجیٹل سسٹمز جیسے ٹریفک کیمرے، ادائیگی کے نظام اور انٹرنیٹ کنٹرول پوائنٹس میں بھی دراندازی کی گئی ہے۔

ان تمام معلومات کا ایک خفیہ مصنوعی ذہانت کے پلیٹ فارم کے ذریعے تجزیہ کیا جاتا ہے جو ایرانی قیادت کی نقل و حرکت اور روزمرہ سرگرمیوں کے بارے میں اہم اشارے حاصل کرتا ہے۔

اسرائیل کی ٹارگٹ کلنگ حکمتِ عملی میں مختلف طریقے شامل ہیں، جیسے مہینوں پہلے نصب کیے گئے بم، ایسے ڈرونز جو عمارتوں کی کھڑکیوں تک پہنچ سکتے ہیں، اور اسٹیلتھ جنگی طیاروں سے داغے جانے والے سپرسونک میزائل۔ یہ تمام حربے غزہ، لبنان اور ایران میں گزشتہ برسوں کی جنگوں کے دوران مزید بہتر کیے گئے ہیں۔

ایک اسرائیلی سکیورٹی اہلکار کے مطابق ایران کی قیادت کو نشانہ بنانے کی ذمہ داری اسرائیل کو اس لیے دی گئی کیونکہ اس کے پاس اس میدان میں تجربہ اور صلاحیت موجود ہے۔ اسرائیلی سکیورٹی اہلکار کے بقول 'انہیں نشانہ بنانا ضروری تھا، اور ہم یہ کام کر سکتے تھے'۔

تاہم یہ ابھی واضح نہیں کہ آیا قیادت کے خاتمے کی یہ مہم اسرائیل کو اپنے بنیادی جنگی اہداف حاصل کرنے میں کامیاب بنا سکے گی یا نہیں۔ ان اہداف میں ایران کے میزائل اور اس کے اتحادی گروپوں کے خطرے کا خاتمہ، اس کے جوہری پروگرام کو روکنا اور حکومت کو اس حد تک کمزور کرنا شامل ہے کہ اسے گرا دیا جائے۔

اب تک یہ مقاصد حاصل ہوتے نظر نہیں آ رہے۔ قتل کیے جانے والے عہدیداروں کی جگہ اکثر زیادہ سخت مؤقف رکھنے والے افراد لے لیتے ہیں جبکہ مسلسل امریکی و اسرائیلی بمباری اور حکومتی کریک ڈاؤن کے خدشے کے باعث عوامی احتجاج بھی سامنے نہیں آ سکا۔

اسرائیلی حکام کے مطابق ایران کی حکومت کو شدید نقصان پہنچا ہے مگر وہ اب بھی مستحکم ہے اور خود کو کامیاب تصور کر رہی ہے کیونکہ اس نے دنیا کی دو بڑی فوجی طاقتوں کے حملوں کا مقابلہ کیا ہے۔

یہ رپورٹ ان اعلیٰ سکیورٹی حکام کے انٹرویو پر مبنی ہے جنہوں نے حساس معلومات کے باعث نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بات کی۔

کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ اسرائیل کی بڑھتی ہوئی مہارت، حتیٰ کہ اگر وہ انتہائی درست نشانہ بازی پر مبنی ہو، ایک خطرناک رجحان کو جنم دے رہی ہے جہاں قتل کو ایک باقاعدہ حکمتِ عملی بنا لیا گیا ہے اور اہداف کی فہرست مسلسل وسیع ہو رہی ہے۔

کارنیگی اینڈومنٹ کے ماہر ایریل لیوائٹ نے کہا کہ 'ہم نے اسے ایک مستقل حکمتِ عملی بنا دیا ہے، حالانکہ یہ صرف مخصوص مواقع پر استعمال ہونے والا طریقہ ہونا چاہیے تھا'۔

انہوں نے مزید کہا کہ اس جنگ میں ذمہ داریوں کی تقسیم سے ایسا تاثر ملتا ہے کہ امریکا نے گندے کام اسرائیل کے حوالے کر دیے ہیں یعنی 'ہم خود انہیں نہیں مار سکتے، لیکن اگر آپ مار دیں تو ہمیں کوئی مسئلہ نہیں'۔

ایک امریکی اہلکار کے مطابق اسرائیل کو ایرانی قیادت پر حملوں کی ذمہ داری دینا دونوں ممالک کے درمیان اس سمجھوتے کا حصہ ہے کہ 'ہم مل کر کام کر رہے ہیں، لیکن ہمارے اپنے الگ اہداف بھی ہیں'۔

امریکی حکام کا کہنا ہے کہ یہ تقسیم قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے نہیں بلکہ دونوں ممالک کی صلاحیتوں کے مطابق کی گئی ہے۔ امریکا ماضی میں بھی ٹارگٹ کلنگ کر چکا ہے جن میں ۲۰۲۰ء میں ایرانی جنرل قاسم سلیمانی کا قتل بھی شامل ہے۔

سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے حالیہ حملوں کو مشترکہ کارروائی قرار دیتے ہوئے کہا کہ 'ہم نے ان کی پوری قیادت کو ختم کر دیا، پھر انہوں نے نئی قیادت منتخب کی، تو ہم نے انہیں بھی ختم کر دیا'۔

اسرائیل نے یہ قیادت کی تبدیلی انتہائی تیزی سے ممکن بنائی، جس کا آغاز ۲۸ فروری کے حملے سے ہوا جس میں آیت اللہ علی خامنہ ای کو قتل کر دیا گیا اور یوں ان کی ۳۷ سالہ حکمرانی کا خاتمہ ہوا۔ اس حملے میں ایران کی دفاعی کونسل کے سربراہ، پاسدارانِ انقلاب کے کمانڈر، مسلح افواج کے سربراہ، وزیر دفاع اور درجنوں دیگر اعلیٰ حکام بھی مارے گئے۔

اگرچہ اس حملے کو ایک بڑی انٹیلی جنس کامیابی قرار دیا گیا لیکن اسرائیلی حکام کے مطابق درحقیقت انٹیلی جنس ادارے گزشتہ ایک سال سے اس 'گروپ آف فائیو' یعنی خامنہ ای اور ان کے قریبی مشیروں کی سرگرمیوں کی مسلسل نگرانی کر رہے تھے۔

ایک اسرائیلی سکیورٹی اہلکار نے بتایا کہ 'وہ تقریباً ہر ہفتے ملاقات کرتے تھے، کبھی مختلف مقامات پر، کبھی زیادہ محفوظ جگہوں پر اور کبھی کم محفوظ ماحول میں'۔

یہ معلومات اس قدر قابلِ اعتماد تھیں کہ ایران کے خلاف جون میں ہونے والی ۱۲ روزہ جنگ سے پہلے بھی اس گروپ کو نشانہ بنانے پر غور کیا گیا تھا تاہم اسے مؤخر کر دیا گیا کیونکہ اس وقت ایران کے جوہری پروگرام کو ترجیح دی گئی تھی۔

اسرائیلی حکام کے مطابق، خامنہ ای اپنے گھر کی بالائی

منزل پر موجود تھے جب انہیں نشانہ بنایا گیا۔ ان کا بیٹا مجتبیٰ خامنہ ای بھی وہاں موجود تھا، جو شدید زخمی ہوا مگر زندہ بچ گیا کیونکہ وہ حملے کے وقت قریبی باغ میں چلا گیا تھا۔

مجتبیٰ خامنہ ای جنہیں بعد میں اپنے والد کا جانشین قرار دیا گیا، اب محدود کردار ادا کر رہے ہیں اور زیادہ تر تنہائی میں رکھے گئے ہیں تاکہ ان کی حفاظت کی جا سکے۔

امریکی اور اسرائیلی حکام کے درمیان تیار کیے گئے جنگی منصوبے میں 'گروپ آف فائیو' کو ابتدائی حملے میں نشانہ بنانا شامل تھا، تاہم آخری لمحے میں وقت تبدیل کیا گیا کیونکہ اسرائیل کو اطلاع ملی کہ ان کی ملاقات شام کے بجائے صبح منتقل کر دی گئی ہے۔

اس وقت امریکا نے بھی ایران کے قریب بڑی فوجی قوت تعینات کر رکھی تھی، مگر حملہ اسرائیلی جنگی طیاروں نے کیا جو اپنے اڈّوں سے تقریباً دو گھنٹے کی پرواز کے بعد ایران پہنچے اور ایرانی قیادت پر میزائل داغے۔

یہ کارروائی دراصل کئی برسوں پر محیط اس کوشش کا نتیجہ تھی جس کے تحت اسرائیل نے ایرانی قیادت کی نقل و حرکت کے بارے میں لمحہ بہ لمحہ معلومات حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ اس میں موساد اور اسرائیلی فوج کا سائبر یونٹ ۸۲۰۰ مرکزی کردار ادا کرتے رہے۔

یہ دونوں ادارے تل ابیب کے شمال میں ایک ہی علاقے میں واقع ہیں اور امریکا کے سی آئی اے اور این ایس اے کے ساتھ مل کر کئی برسوں سے ایران کے خلاف خفیہ کارروائیوں میں تعاون کرتے رہے ہیں، جن میں ۲۰۱۰ء کا مشہور 'اسٹکس نیٹ' سائبر حملہ بھی شامل ہے۔

اسرائیلی حکام کے مطابق ایران کی قیادت کو نشانہ بنانے کے لیے استعمال ہونے والی بہت سی جدید انٹیلی جنس صلاحیتیں دراصل پانچ سال قبل شروع ہونے والی ایران اور اسرائیل کے درمیان سائبر جنگ کے بعد سامنے آئیں۔

جب ایران کی جانب سے مبیّنہ سائبر حملوں نے اسرائیل کے پانی کے نظام اور دیگر بنیادی ڈھانچے کو متاثر کیا تو اسرائیل نے بھرپور جوابی کارروائی کی۔ ان حملوں کے نتیجے میں تہران میں ٹریفک سگنلز متاثر ہوئے، پیٹرول پمپس بند ہو گئے اور بعض نیم فوجی دستوں کے ارکان کو اے ٹی ایم سے رقم نکالنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

تاہم یہ کارروائیاں دراصل ایک بڑے اور خفیہ سائبر آپریشن کا حصہ تھیں، جس کے تحت اسرائیلی یونٹ ۸۲۰۰ نے ایران کے ڈیجیٹل نظام میں گہری رسائی حاصل کر لی۔

ایک اسرائیلی فوجی اہلکار کے مطابق 'جو کچھ بھی ہیک کیا جا سکتا تھا، ہم نے اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی، فون کال، ٹریفک کیمرے، حتیٰ کہ اندرونی سکیورٹی سسٹم بھی'۔

ان اہداف میں وہ ڈیٹا بیس بھی شامل تھے جن میں ایرانی سکیورٹی اداروں نے ہنگامی حالات میں قیادت کے محفوظ ٹھکانوں اور متبادل مراکز کی معلومات محفوظ کر رکھی تھیں۔

اسرائیلی اہلکار کے مطابق 'کبھی ہمیں پاسدارانِ انقلاب کے انٹیلی جنس ونگ کے ڈیٹا تک رسائی ملی، کبھی فوج یا پولیس کے نظام تک۔ وقت کے ساتھ ہم معلومات حاصل کرنے میں زیادہ مؤثر ہوتے گئے'۔

ایران کی اندرونی نگرانی اور عوام پر کنٹرول کی پالیسیوں نے بھی اس کے لیے کمزوریاں پیدا کیں۔ حالیہ برسوں میں ایران نے انٹرنیٹ ٹریفک کو مرکزی نظام کے ذریعے کنٹرول کرنا شروع کیا تاکہ ضرورت پڑنے پر اسے بند کیا جا سکے۔

تاہم اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومتی اہلکاروں کی اپنی کمیونی کیشن بھی اسی نظام سے گزرتی رہی، جس سے اسرائیل کو خفیہ طور پر ان کے پیغامات، کالز اور ای میلز تک رسائی حاصل کرنے کا موقع ملا۔

ایران نے ان خطرات کے پیشِ نظر اقدامات بھی کیے، جیسے سکیورٹی اہلکاروں کے موبائل فون استعمال پر پابندیاں، مگر اسرائیلی حکام کے مطابق یہ اقدامات صرف عارضی رکاوٹ ثابت ہوئے۔

ایک اہلکار نے بتایا کہ 'آپ ڈیوٹی کے دوران فون استعمال نہ بھی کریں، لیکن جیسے ہی ڈیوٹی ختم ہوگی آپ فون ضرور چیک کریں گے۔ کوئی بھی ہمیشہ کے لیے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا'۔

ان تمام معلومات کو مؤثر بنانے میں ایک جدید مصنوعی ذہانت کا پلیٹ فارم کلیدی کردار ادا کر رہا ہے جو ایران سے حاصل ہونے والے وسیع ڈیٹا کا تجزیہ کرتا ہے اور قیادت کی نقل و حرکت اور طرزِ زندگی کے بارے میں اہم معلومات اخذ کرتا ہے۔

اس شعبے کے ماہر راز زمت کے مطابق، یہ اے آئی نظام ایسی معلومات کو قابلِ استعمال بناتا ہے جو پہلے موجود تو تھیں مگر ان کا تجزیہ ممکن نہیں تھا۔

انہوں نے کہا کہ 'اے آئی نے اسرائیل کو وہ صلاحیت دی ہے کہ وہ ایسے ڈیٹا سے فائدہ اٹھا سکے جو پہلے موجود ہونے کے باوجود ناقابلِ استعمال تھا۔

گزشتہ برس ایران کے جوہری پروگرام کے خلاف ۱۲ روزہ کارروائی کے دوران ان صلاحیتوں کی ایک جھلک سامنے آئی جب اسرائیل نے بیک وقت ایرانی فوجی قیادت کو نشانہ بنایا۔

اسرائیلی حکام کے مطابق، بعض اہداف کے بارے میں انٹیلی جنس اتنی درست تھی کہ میزائلوں کا رخ دورانِ پرواز ہی تبدیل کیا گیا تاکہ ہدف کی بدلتی ہوئی جگہ کے مطابق نشانہ لگایا جا سکے۔ ایک حملے میں ایک کمانڈر کو اُس وقت نشانہ بنایا گیا جب وہ دفتر سے قریبی اپارٹمنٹ کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔

تاہم ہر بار معلومات مکمل طور پر درست ثابت نہیں ہوئیں۔ مارچ کے اوائل میں اسرائیل نے قُم میں ایک عمارت کو نشانہ بنایا جہاں ایران کی مجلسِ خبرگان کے ارکان کے جمع ہونے کی توقع تھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اجلاس آن لائن ہو رہا تھا اور کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ اسرائیل ماضی میں بھی مختلف طریقوں سے ٹارگٹ کلنگ کرتا رہا ہے، جن میں موٹر سائیکل سوار حملہ آوروں کے ذریعے گاڑیوں پر بم نصب کرنا یا خفیہ دھماکا خیز مواد استعمال کرنا شامل ہے۔ تاہم حالیہ مہم میں زیادہ تر فضائی حملوں اور مسلسل نگرانی کرنے والے ڈرونز کا استعمال کیا گیا۔

اسرائیلی حکام کا کہنا ہے کہ اس مہم کی کامیابی میں ایک اہم عنصر ایرانی قیادت کی بعض غیر متوقع غلطیاں بھی ہیں۔

ان کے مطابق حیران کن طور پر اتنے بڑے خطرے کے باوجود ایرانی قیادت ایک جگہ جمع ہوئی، حالانکہ حالات ایسے تھے کہ کسی بھی وقت حملہ متوقع تھا۔

ایک اسرائیلی اہلکار نے کہا کہ 'یہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ دنیا کا کوئی بھی شخص اس صورتِ حال میں خطرے کو بھانپ لیتا'۔

(مترجم: بن فاروق)

"Israel targets Iran's leaders with lethal expertise using new AI platform". ("Washington Post". March 30, 2026)

برصغیر پاک و ہند کا معروف علمی و تحقیقی رسالہ

سہ ماہی "تحقیقاتِ اسلامی" علی گڑھ

تازہ شمارہ اپریل تا جون ۲۰۲۶ء

حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: ۰۲۱-۳۶۳۶۸۰۲۰

ایران جنگ کا خاتم کیسے ہو؟

Alon Ben-Meir

جنگ کسی کو کچھ نہیں دیتی۔ نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے، نقصان دونوں یا تمام ہی فریقوں کا ہوتا ہے۔ ہر جنگ اپنے پیچھے تباہی چھوڑ جاتی ہے۔ جن اقوام نے برسوں کی محنت کے بعد کچھ پایا ہوتا ہے، جنگ انہیں کچھ ہی دنوں میں کنگال اور کھوکھلا کر دیتی ہے۔ جنگ کسی بھی حال میں بہترین حل قرار نہیں دی جاسکتی۔ عالمی تاریخ گواہ ہے کہ ہر جنگ نے انسانوں کو پسماندگی سے دوچار کیا ہے، خرابیوں کے گڑھے میں دھکیلا ہے۔

امریکا نے اسرائیل کے ساتھ مل کر ایران کے خلاف جنگ چھیڑی ہے۔ ایران کے سپریم لیڈر علی خامنہ ای کی شہادت نے معاملات کو مکمل جنگ تک پہنچادیا۔ اب معاملہ یہ ہے کہ اسرائیل اور امریکا مل کر ایران کو نشانہ بنارہے ہیں اور ایرانی فوج اسرائیل کے ساتھ ساتھ خلیجی ممالک میں امریکا کے فوجی اڈوں اور دیگر تنصیبات کو نشانہ بنارہا ہے۔ یہ سب کچھ کسی بہت بڑی جنگ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ روس اور چین کے بیانات بہت پریشان کن ہیں۔ امریکی قیادت بھی اِس بات سے ڈرتی ہے کہ کہیں کوئی حقیقی بین الاقوامی جنگ نہ چھڑ جائے۔ ایسی حالت میں بہت تباہی واقع ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ ایران سے جنگ کیسے ختم کی جائے۔ امریکی قیادت اِس حوالے سے پریشان ہے کیونکہ اُس پر اندرونِ ملک بھی بہت تنقید کی جارہی ہے۔

ایران سے جنگ چھیڑے ہوئے امریکی قیادت کو اب ایک ماہ ہونے والا ہے مگر اب تک واضح نہیں ہے کہ یہ جنگ ختم کیسے ہوگی اور ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ امریکا کے پاس اِس وقت واپسی کا کوئی حقیقی کارگر راستہ نہیں۔

چار منظرنامے

بہت سے منظرنامے ذہنوں کے پردوں پر ابھر رہے ہیں۔ ایک ممکنہ منظرنامہ یہ ہوسکتا ہے کہ امریکی فضائیہ اور بحریہ ایران کو بڑے پیمانے پر نشانہ بناتی رہیں اور پھر یک طرفہ طور پر جنگ میں فتح کا اعلان کردیں۔ دوسرا ممکنہ منظرنامہ یہ ہوسکتا ہے کہ چند علاقائی اور دیگر ممالک مل کر مذاکرات کے ذریعے جنگ ختم کروائیں۔ ایسی صورت میں ہونے والی جنگ بندی قدرے پائیدار ثابت ہوسکتی ہے۔ تیسرا منظرنامہ یہ ہوسکتا ہے کہ جنگ میں زمینی یا بری فوج کا کردار وسعت اختیار کرے اور معاملات انتہائی خطرناک رخ اختیار کریں۔ چوتھا منظرنامہ یہ ہوسکتا ہے کہ علاقائی سطح پر ہونے والی یہ جنگ وسعت اختیار کرے اور کئی ممالک اِس جنگ کی بھٹی میں کود پڑیں۔ ایسی صورت میں تیسری عالمی جنگ کا خطرہ مزید توانا ہوسکتا ہے۔

اِن چار ممکنہ منظرناموں میں صرف بات چیت کے ذریعے جنگ بندی کا آپشن ہی معقول ہے کیونکہ اِسی صورت اِس بظاہر بلاجواز جنگ کو مزید وسعت اختیار کرنے اور عالمی جنگ کی سی شکل اختیار کرنے سے روکا جاسکتا ہے۔

عراق اور لیبیا کو ذہن میں رکھیے!

ٹرمپ انتظامیہ میں انتہا پسندوں کی بھرمار ہے۔ بیرونِ ملک عسکری مہم جُوئی کے شوقین بڑی تعداد میں ہیں۔ امریکا نے چند عشروں کے دوران متعدد ممالک میں عسکری مہم جُوئی کی ہے اور اِس کے نتائج بھی بھگتے ہیں۔ امریکیوں کا ایک بڑا شوق یہ بھی ہے کہ جن ملکوں سے خطرہ محسوس ہو رہا ہو یا جو امریکی پالیسیوں کی کُھل کر مخالفت کرتے ہوں اُن کی حکومت بدل دی جائے اور اگر ممکن ہو تو طرزِ حکومت بھی تبدیل کردی جائے۔ ایران، ویتنام، نکاراگوا، افغانستان، عراق، لیبیا اور دوسرے بہت سے مسلم اور غیر مسلم ممالک میں یہ سارے تماشے ہوتے رہے ہیں۔ حکومتیں تبدیل کرنے کی کوششوں نے بہت تباہی مچائی ہے اور امریکا کو بھی اِس کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے۔

عراق اور لیبیا میں عسکری مہم جُوئی اور حکومت تبدیل کرنے کی کوششوں کے نتیجے میں امریکا سمیت پورے مغرب نے بہت اہم سبق سیکھا ہے۔ یورپ نے معاملات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔

امریکا کو کیا چاہیے؟

امریکا اِس وقت الجھا ہوا ہے۔ اسرائیل کے ساتھ اُس نے ایران پر حملہ تو کیا ہے اور جنگ بھی مسلط کی ہے مگر جو کچھ وہ چاہتا تھا، وہ نہیں ہوسکا ہے۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ ایران کے معاملے میں اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ اب امریکا چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طور ٹرمپ انتظامیہ کو فتح کا اعلان کرنے کا موقع مل جائے اور اِس کے لیے وہ ایران کو دبوچنے سے بھی گریز کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ایران کا گلا دبانے کے لیے ایک خاص حد سے آگے جانے کی کوشش نہ کی جائے اور ایران شکست بھی تسلیم کرلے۔

امریکا چاہے گا کہ ایک ایسا بیانیہ تیار کیا جائے جس میں ایران کی طرف سے کی جانے والی مزاحمت سے پیدا ہونے والی سُبکی کا بھی ازالہ ہو اور یہ دعویٰ پوری قوت سے کیا جاسکے کہ امریکا نے ایرانی فوج کی کمر توڑ دی ہے، میزائل پروگرام تباہ کردیا ہے اور ایٹمی ہتھیار بنانے کے عزائم کی بھی بنیاد ہلادی ہے۔

ایسا کوئی بھی بیانیہ آسانی سے پیش نہیں کیا جاسکتا۔ امریکا کو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ اُس نے ایران کے خلاف جنگ جیت کر دراصل کوئی بہت بڑا تعمیری کام کیا ہے۔ جنگ کے خاتمے اور فتح کے اعلان پر مبنی اعلانیے کو سفارت کاری اور تعمیری سوچ کے حوالے سے بھی مضبوط ہونا چاہیے۔ امریکا کو بتانا ہوگا کہ اُس نے ایران پر حملہ کرکے کوئی غلطی نہیں کی، بلکہ دنیا کو بہت کچھ دیا ہے۔ اِس کے لیے لازم ہے کہ امریکا جنگی کارروائیاں روکے اور دنیا کو بتائے کہ معاملات اب مکمل امن کی طرف چل پڑے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بیک ڈور چینل کے ذریعے بات چیت کی جاتی رہنی چاہیے تاکہ دنیا کو یقین ہو کہ اب کچھ مثبت اور تعمیری ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔

ایران کو کیا چاہیے؟

ایران کے لیے بھی صورتِ حال بہت نازک ہے۔ اُسے کئی بار انتہائی پریشان کن صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جدید ایران کی تاریخ بہت سے ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جن کے طفیل سے ایرانی عوام اور حکومت دونوں ہی کے لیے ذلت اور پریشانی کا سامان ہوا ہے۔ امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے نے ۱۹۵۳ء میں ایران میں مداخلت کی اور منتخب وزیرِ اعظم محمد مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جس کے نتیجے میں بادشاہت کا ادارہ انتہائی مضبوط ہوگیا۔ اِس کے بعد انقلاب کے پیش منظر میں عراق نے ایران پر جنگ تھوپی۔ اس آٹھ سالہ جنگ نے دونوں ہی ملکوں کو تباہی کے دہانے پر پہنچایا۔ ایران کو اپنی طرزِ حکومت کے باعث عشروں تک اقتصادی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایران نے مغرب کے سامنے ڈٹ کر مزاحمت کرنے کی بہت بھاری قیمت چُکائی ہے۔

اگر امریکا نے ایران کے سپریم لیڈر علی خامنہ ای کی شہادت یا ایرانی فوج کو کچلنے کے عمل کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور ایرانی قوم کو ذلیل کرنے کی کوشش کی تو ایرانی قیادت کے لیے مذاکرات کی میز پر آنا انتہائی دشوار ہوجائے گا۔

اگر امریکا چاہتا ہے کہ ایران لچک دکھائے تو لازم ہے کہ ایرانی قیادت کو عوام کے سامنے یہ کہنے کا موقع دیا جائے کہ ایرانی فوج نے پورے وقار کے ساتھ قوم اور وطن کا دفاع کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایران کو چند ایک معاملات میں رعایتیں بھی دینا پڑیں گی۔ امریکی قیادت کو یہ بات سمجھنا ہوگی کہ ایرانی فوج اور حکومت دونوں کو جھکنے پر مجبور کرنے سے گریز کرنا ہوگا۔

بیک ڈور چینل اور بات چیت

اس وقت بیک ڈور چینلز کے ذریعے بات چیت بہت مشکل دکھائی دیتی ہے مگر یہ سب تو کرنا ہی پڑے گا۔ قطر اور عمان اِس معاملے میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ کسی بھی جنگ کو رُکوانے کے لیے بیک ڈور چینل کام کرتے ہی ہیں۔ یہ مرحلے جس قدر جلد آئے، اُتنا ہی اچھا ہے۔ بلاواسطہ یا بالواسطہ بات چیت سے قبل بہت کچھ طے کرنا ہوگا۔ پہلے تو ریڈ لائنز کا تعین کرنا ہوگا۔ اِس کے بعد متعدد معاملات کو آپس میں جوڑنا ہوگا۔ تصدیق بھی لازم ہے۔ ایرانی قیادت بھی بات چیت چاہتی ہوگی مگر اُس کے لیے تمام لوازم کے بغیر مذاکرات کی میز پر آنا ممکن نہ ہوگا۔

ایران کو امریکا کے ہاتھوں غیر معمولی نقصان اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ وہ ڈونلڈ ٹرمپ پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ ٹرمپ نے اپنے پہلے دورِ صدارت میں ایران سے کیا جانے والا ایٹمی معاہدہ مسترد کر دیا تھا۔ یہ معاہدہ ایران نے ۶ ترقی یافتہ ملکوں کے نمائندوں سے مذاکرات کے بعد کیا تھا۔ جون ۲۰۲۵ء میں مذاکرات کے دوران اور پھر فروری ۲۰۲۶ء میں بھی مذاکرات کے دوران ہی امریکا اور اسرائیل نے ایران پر حملہ کیا۔ اگر ایران سے بات چیت کو کامیابی سے ہمکنار کرنا ہے تو لازم ہے کہ پہلے خلیجی طاقتیں یہ عمل شروع کریں اور پھر برطانیہ اور سعودی عرب بھی اس عمل میں شریک ہو سکتے ہیں۔

ایران چاہے گا کہ مذاکرات اگر ہوں تو جامع اور بامعنی ہوں۔ جنگ بندی ہو تو طویل اور پائیدار ہو۔ دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ فریقین واقعی امن چاہتے ہیں۔

ایران کی تفہیم اور مذاکرات کار

ایک سوال یہ بھی ہے کہ اگر امریکا کو ایران سے مذاکرات کرنے ہوں تو مذاکرات کار کون ہوں۔ امریکی صدر ٹرمپ کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ ذاتی وفاداروں اور ریئل اسٹیٹ ایجنٹس کو مذاکرات کے لیے بھیجتے ہیں۔ وہ ہر معاملے میں اپنے ذاتی مفادات کو ذہن نشین اور مقدم رکھتے ہیں۔ جب مذاکرات کے نام پر محض سودے بازی ہو رہی ہو تو مذاکرات کی کامیابی اور کسی حقیقی امن معاہدے کی کچھ زیادہ توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

ایران سے مذاکرات وہی لوگ کریں جو ایران کو اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہوں۔ انہیں ایران پر عائد کی جانے والی اقتصادی پابندیوں اور علاقائی سلامتی کے تمام محرکات کا بخوبی علم ہو۔ وہ ایران کے ایٹمی اور میزائل پروگرام کے بارے میں بھی سب کچھ جانتے ہوں۔ ایرانی سیاست کی مجموعی نفسیات اور مختلف سیاسی دھڑوں کی حرکیات کو بھی اِس کا بھرپور علم ہونا چاہیے۔

ایران سے مذاکرات کے لیے امریکا کے پہلی صف کے سفارت کار اور بین الاقوامی امور کے ماہرین متعین کرنے چاہئیں۔ یہ مذاکرات غیر معمولی نوعیت کے ہوں گے۔ اِن کے نتائج پر پوری دنیا کے امن کا مدار ہوگا۔

حقیقت پسندانہ امریکی ایجنڈا؟

اگر امریکا یہ سمجھتا ہے کہ وہ مذاکرات کی میز پر اپنی ہر بات منوانے میں کامیاب ہو جائے گا تو یہ محض خوش فہمی ہے اور غلط سوچ بھی۔ ایران ہر بات نہیں مان سکتا۔ امریکی قیادت کو حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرنا ہوگا تاکہ مذاکرات کا معقول ایجنڈا تیار کیا جا سکے۔ امریکا اگر معقول مذاکراتی ایجنڈا تیار کرنا چاہے تو اُس میں درج ذیل نکات شامل کیے جا سکتے ہیں۔

☆ ایرانی قیادت امریکی افواج پر حملے کرنے اور پڑوسی ممالک کو کمزور کرنے والے اپنے عسکریت پسند گروپوں کی فنڈنگ بند کرے۔

☆ ۱۹۶۰ء کی دہائی سے جاری یورینیم افزودہ کرنے کا اپنا پروگرام بند کرے۔ اس حوالے سے ایک جامع منصوبہ تیار کیا جا سکتا ہے جس کے تحت افزودہ یورینیم کے ذخائر کو بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔

☆ ایران اور اسرائیل کے درمیان ایک ایسا سکیورٹی فریم ورک تیار کیا جا سکتا ہے جس کے تحت ایرانی قیادت اسرائیل کو بلاواسطہ اور بالواسطہ دھمکیاں دینا ترک کرے اور دوسری طرف اسرائیل بھی ایرانی قیادت کو دھمکانے کا سلسلہ روک دے۔

اگر امریکا اپنے بنیادی نکات منوانا چاہتا ہے تو اُسے بھی خالصاً سویلین مقاصد کے لیے چلائے جانے والے ایرانی ایٹمی پروگرام کا احترام کرنا ہوگا اور اُسے بند کرنے کے مطالبے سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ امریکا کو ایران کے خلاف، ایٹمی پروگرام کی پاداش میں لگائی جانے والی، پابندیوں کو اٹھانا ہوگا اور اِس سلسلے میں اپنے کلیدی حلیفوں سے مشاورت کرنا ہوگی۔ ایران کو ایٹمی پروگرام کے حوالے سے چند ایک حدود کا خیال رکھنے کا پابند کرنا ہوگا۔ ایران کے اثاثوں کو بحال کرنا بھی ایک بنیادی معاملہ ہے۔ جب تک ایران کے اثاثے بحال نہیں کیے جاتے تب تک معاملات درست نہ ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی یقینی بنانا ہوگا کہ ایران کے اندرونی سیاسی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ ایران سے معاملات کو معمول کی سطح پر لانے میں ایک زمانہ لگ سکتا ہے۔ یہ عمل ایک بار شروع ہو جائے تو پھر پیشرفت بھی ہوتی رہے گی۔

یہ راستہ آسان نہیں!

اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جب ایران سے مذاکرات کا معاملہ آئے گا تو امریکا اور یورپ میں بہت سے انتہا پسند چاہیں گے کہ ایران سے اوّل تو بات چیت نہ ہو اور اگر ہو تو چند بنیادی شرائط کے تحت ہوں یعنی ایران کو پابند کیا جائے کہ وہ عسکریت پسند گروپوں کی حمایت اور امداد بند کرے۔ امریکا میں بھی ایسے انتہا پسند بہت بڑی تعداد میں ہیں اور اُن کا اثر و رسوخ بھی بہت زیادہ ہے۔ خود ڈونلڈ ٹرمپ بھی غیر معمولی انتہا پسند ہیں اور قدرے منتقم مزاج بھی۔ امریکا میں انتہا پسند نہیں چاہیں گے کہ ایران کو سویلین مقاصد کے لیے ایٹمی پروگرام جاری رکھنے کی اجازت دی جائے۔

اگر معاملات کو درست نہ کیا گیا تو دنیا بھر میں طرح طرح کے بحران سر اٹھاتے رہیں گے۔ بیشتر معیشتیں ڈانواڈول حالت میں رہیں گی اور توانائی کا بحران خطرناک شکل اختیار کرتا رہے گا۔ اگر ایران کو زیادہ دبانے کی کوشش کی گئی تو وہاں انتہا پسندوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوگا اور یوں ایرانی قیادت انتہا پسندی کی راہ ہی پر گامزن رہے گی۔

اسرائیل ڈیل کی راہ روکے گا؟

اگر امریکا چاہتا ہے کہ ایران سے مذاکرات بامقصد، بامعنی اور تعمیری ہوں (جن کے نتیجے میں کوئی معقول امن معاہدہ ممکن ہو پائے) تو پھر اُسے اپنی ایران پالیسی کو اپنے حالات و واقعات کے تناظر میں چلانا ہوگا نہ کہ اسرائیل کی مرضی کے مطابق۔ اگر امریکا کی ایران پالیسی پر اسرائیل اثر انداز ہوتا رہے تو پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ایران کے ساتھ جامع، مثبت اور تعمیری امن معاہدہ شاید کبھی نہ ہو پائے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۲ \\\\\\

علی لاریجانی کے جانشین کون ہیں؟

بریگیڈیئر جنرل محمد باقر ذوالقدر کو ممتاز ایرانی رہنما علی لاریجانی کی جگہ ایران کی سپریم نیشنل سکیورٹی کونسل کا سیکرٹری مقرر کیا گیا ہے۔

علی لاریجانی حال ہی میں اپنے بیٹے کے ساتھ اس وقت مارے گئے جب ایک اسرائیلی میزائل نے ان کی رہائش گاہ کو نشانہ بنایا۔

باقر ذوالقدر کی تقرری ایران کے خلاف امریکی اور اسرائیل کی قیادت میں جاری اس جنگ کے دوران ہوئی ہے جس میں ان دونوں ممالک کا ہدف ملک کی اہم عسکری اور سیاسی شخصیات ہیں۔ ذوالقدر پاسدارانِ انقلاب کور کے سابق کمانڈر رہ چکے ہیں اور ان کی تقرری کا اعلان ایرانی صدر کے دفتر کے ایک اہلکار نے کیا۔

خبر رساں ادارے 'رائٹرز' کا کہنا ہے کہ ذوالقدر کو ایران کی جس سپریم نیشنل سکیورٹی کونسل کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے، اس کی باضابطہ صدارت ایرانی صدر کرتے ہیں۔

یہ ادارہ ملک کی سلامتی اور خارجہ پالیسیوں میں ربط قائم رکھنے کا ذمہ دار ہے اور اس میں سینئر فوجی، انٹیلی جنس اور حکومتی اہلکاروں کے علاوہ رہبرِ اعلیٰ کے نمائندے بھی شامل ہیں، جن کا تمام ریاستی امور پر فیصلہ حتمی ہوتا ہے۔

باقر ذوالقدر کون ہیں؟

ایران کی خبر رساں ایجنسی 'مہر' کے مطابق ذوالقدر پاسداران انقلاب کے ان ابتدائی ارکان میں سے ایک ہیں، جنہوں نے ایران۔عراق جنگ میں حصہ لیا۔ انہوں نے جنگ کے بعد کچھ عرصہ کے لیے آئی آر جی سی کے نائب کمانڈر اِن چیف کے طور پر خدمات انجام دیں۔

اس کے علاوہ وہ وزارت داخلہ اور عدلیہ کے ساتھ بھی بطور معاون کام کرتے رہے اور سپریم نیشنل سکیورٹی کونسل کے سیکرٹری کے طور پر تقرری کے وقت وہ سیکرٹری اور ایکسپیڈینسی کونسل کے رکن بھی تھے۔

۱۹۵۱ء میں صوبہ فارس کے شہر فاسا میں پیدا ہونے والے محمد باقر ذوالقدر منصورن نامی اس مسلح گروہ کے پہلے ارکان میں شامل تھے، جس نے ۱۹۷۹ء کے انقلاب سے پہلے شاہ محمد رضا پہلوی کی حکومت کے خلاف خاص طور پر جنوبی ایران میں کارروائیاں کیں۔

اس گروہ پر ایک امریکی مشیر اور ایرانی آئل کمپنی کے ایک اہلکار کے قتل کے بھی الزامات ہیں۔

'منصورون: بنیاد سے اتحاد تک' کے عنوان سے ایک مضمون میں، جو 'ہسٹوریکل اسٹڈیز' نامی جریدے میں شائع ہوا، باقر ذوالقدر نے اس گروپ کو قتل کی وارداتوں کے لیے دستیاب قانونی تحفظ کے بارے میں بات کی، اور کہا کہ انہوں نے اور ان کے دیگر ساتھیوں نے بہبہان کے تھانے کے سامنے دو پولیس افسران کو ۱۵ گولیاں مار کر قتل کیا۔

ایران۔عراق جنگ کے دوران، ذوالقدر پاسدارانِ انقلاب کے رمضان ہیڈکوارٹر کے کمانڈر تھے، جو غیر روایتی طریقوں سے بیرون ملک کارروائیاں انجام دیتا تھا اور جسے بعدازاں قدس فورس کے قیام کا مرکز سمجھا گیا۔

۱۹۸۴ء تک رمضان ہیڈکوارٹر پاسدارانِ انقلاب کے اندر ایک غیر منظم جنگی فورس کے طور پر قائم ہو چکا تھا، اور اس کی ساخت میں عراق کے کرد، شیعہ، افغان اور دیگر عناصر شامل تھے، اور یہ آئی آر جی سی کے بیرونِ ملک کام کو بڑھانے کے لیے ایک اہم نقطۂ آغاز تھا۔

جنگ کے اختتام کے بعد، وہ جنرل اسٹاف آف دی گارڈز کے سربراہ بنے، جسے ۱۹۹۱ء میں جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کا نام دیا گیا اور ۱۹۹۷ء میں محسن رضائی کے استعفے اور یحییٰ رحیم صفوی کی گارڈز کمانڈر کے طور پر تقرری کے بعد، ذوالقدر نے ڈپٹی کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھالا۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں، انہیں انصار حزب اللہ جیسے گروپوں کی تنظیم کی ذمہ داریوں میں شامل کیا گیا، اور غلام حسین کرباسچی کے دور میں سکیورٹی اور عدالتی دستاویزات کی رپورٹس میں بھی ان کا ذکر ہوا۔

محمود احمدی نژاد کے ۲۰۰۵ء میں صدر منتخب ہونے کے بعد، ذوالقدر کو نائب وزیر داخلہ برائے سلامتی امور مقرر کیا گیا، جو ایران کے اندر سکیورٹی فائلز کے انتظام میں ایک اہم عہدہ تھا۔

اس وقت، انہیں احمدی نژاد کو اقتدار میں لانے کے لیے کردار ادا کرنے والے رہنماؤں میں شمار کیا جاتا تھا، اور بعد میں انہوں نے ایک 'کثیر سطحی منصوبے' کے وجود کو تسلیم کیا تاکہ قدامت پسند تحریک انتخابات میں کامیابی حاصل کر سکیں۔

تاہم ۲۰۰۷ء میں اس وقت کے سرکاری حکام کے ساتھ اختلافات کی خبریں سامنے آنے کے بعد انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

اِسی سال اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ان کا نام جوہری اور میزائل پروگراموں سے منسلک ۱۵ ایرانی حکام کی فہرست میں شامل کیا، جس میں سفری اور اثاثوں کے انجماد کی پابندیاں عائد کی گئیں۔

جب صادق املی لاریجانی ملک کی عدلیہ کے سربراہ تھے تو باقر ذوالقدر نے اس دَور میں ان کے سماجی مشیر اور تزویراتی اُمور کے نائب کے طور پر خدمات انجام دیں۔

ستمبر ۲۰۲۱ء میں، انہیں ایکسپیڈینسی کونسل کے سربراہ اور سپریم لیڈر کی منظوری سے کونسل کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

ذوالفقار ایرانی حکومت کے اندر سخت گیر فوجی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

انہوں نے بار بار ایران پر کسی بھی امریکی حملے کے بارے میں خبردار کیا ہے کہ پاسدارانِ انقلاب ردعمل کے لیے تیار ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں مہر نیوز ایجنسی کے حوالے سے ایک بیان میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر ایران پر حملہ ہوا تو 'امریکا کے لیے کوئی محفوظ جگہ نہیں ہوگی' اور تہران امریکی اہداف پر 'روزانہ ہزاروں میزائل' داغنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

وہ ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں جس کا عنوان 'اسرائیل کا زوال' ہے۔

اسے انہوں نے مہدی حمد الفتلوی کی ۲۰۰۱ء میں پہلی بار بیروت سے شائع ہونے والی کتاب کے 'ترجمے اور تحقیق' کے طور پر پیش کیا اور یہ اسرائیل کے ساتھ تنازع کے مذہبی نظریاتی وژن سے متعلق ہے۔

اگست ۲۰۲۵ء میں، ۱۲ دن کی لڑائی کے بعد، ذوالقدر نے کہا کہ امریکا کے ساتھ کسی بھی بات چیت کو 'امریکیوں کو جوابدہ ٹھہرانے' پر مرکوز ہونا چاہیے۔

پریس ٹی وی نے آئی آر جی سی کے حوالے سے ایک بیان میں محمد باقر ذوالقدر کی اس حساس عہدے پر تقرری کا خیر مقدم کرتے ہوئے انہیں اسلامی انقلاب کے 'باقی ماندہ اثاثوں' میں سے ایک قرار دیا، اور اسلامی جمہوریہ کی تاریخ میں ان کے اہم کردار کی تعریف بھی کی۔

اس بیان میں ان کی جانب سے شاہ کے نظام اور ایم ای کے کا مقابلہ کرنے اور ایران۔عراق جنگ میں ان کی شرکت کو اجاگر کیا گیا تھا۔

(بحوالہ: ''بی بی سی اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۸ مارچ ۲۰۲۶ء)

آبنائے ہرمز کھلوانے کی جنگ کیسی ہوگی؟

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا کہنا ہے کہ وہ ایران پر حملے بند کرنے کے لیے ایرانی قیادت سے بات چیت کر رہے ہیں جبکہ ایران اس کی تردید کر رہا ہے۔

تاہم ایک بات واضح ہے کہ امریکا مذاکرات کی ناکامی کی صورت میں متبادل منصوبہ بھی تیار کر رہا ہے۔

امریکی میرینز کے دو بڑے دستے خلیج کی جانب روانہ ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک خصوصی فضائی حملہ آور ڈویژن بھی جلد تعینات کیا جاسکتا ہے۔ یہ پیشرفت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ امریکا آبنائے ہرمز کو طاقت کے ذریعے کھولنے پر غور کر رہا ہے جو ایک نہایت مشکل اور خطرناک اقدام ہوگا۔

''آپریشن ایپک فیوری'' کے آغاز سے ہی ایران نے آبنائے ہرمز کو خطرے میں ڈال رکھا ہے جس کے باعث دنیا بھر میں تیل اور مائع گیس کی تقریباً ۲۰ فیصد ترسیل متاثر ہو رہی ہے۔ اب تک ۱۹ تجارتی جہازوں کو نشانہ بنایا جاچکا ہے جس سے بحری ٹریفک انتہائی کم ہوگئی ہے اور عالمی منڈیوں میں شدید بے چینی پیدا ہوگئی ہے۔

پینٹاگون کے پاس آبنائے کو کھولنے کے لیے تین مرحلوں پر مشتمل منصوبہ موجود ہے۔

پہلا مرحلہ ایران کی ان فوجی صلاحیتوں کو ختم کرنا ہے جو جہاز رانی کے لیے خطرہ ہیں جیسے تیز رفتار کشتیاں، میزائل، ڈرونز اور بارودی سرنگیں۔ اس مرحلے میں بنیادی کردار فضائیہ ادا کرے گی تاہم زمینی فوج بھی اس میں شامل ہوسکتی ہے۔

دوسرا مرحلہ آبنائے ہرمز میں موجود بارودی سرنگوں کی صفائی ہے اور آخری مرحلے میں امریکی بحریہ تیل بردار جہازوں کو محفوظ راستہ فراہم کرے گی۔ ہر مرحلہ کئی ہفتوں پر محیط ہوسکتا ہے اور اس میں امریکی افواج کو بڑے خطرات کا سامنا ہوگا۔

ایران کے پاس جہازوں پر حملے کے متعدد طریقے موجود ہیں۔ میزائل اور ڈرونز فضا سے حملہ کرسکتے ہیں جبکہ تیز رفتار کشتیاں دھماکا خیز مواد کے ساتھ جہازوں سے ٹکرا سکتی ہیں یا ان پر میزائل فائر کرسکتی ہیں اسی طرح پانی کے اندر مختلف اقسام کی بارودی سرنگیں موجود ہوسکتی ہیں۔

ان حملوں کے لیے استعمال ہونے والا ساز وسامان اور اہلکار ساحلی علاقوں میں غاروں، سرنگوں اور خفیہ مقامات پر چھپے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں صرف فضائی حملوں سے مکمل طور پر ختم کرنا مشکل ہوتا ہے۔

حالیہ دنوں میں امریکی جنگی طیاروں نے ایران کے ساحلی علاقوں پر شدید بمباری کی ہے۔ ۱۹ مارچ کو امریکا کے اعلیٰ فوجی افسر نے بتایا کہ لڑاکا طیاروں نے ۵ ہزار پاؤنڈ وزنی بم استعمال کیے تاکہ زیرِ زمین بنکروں کو تباہ کیا جاسکے جہاں اینٹی شپ میزائل محفوظ کیے گئے تھے۔

امریکا نے ہیلی کاپٹر اور نچلی پرواز کرنے والے حملہ آور طیارے بھی تعینات کیے ہیں، جن میں اے۔۱۰ وارتھوگ شامل ہے، جو ایک طرح سے فضائی مشین گن کے طور پر کام کرتا ہے۔ ان کارروائیوں کے نتیجے میں ۱۲۰ سے زائد ایرانی بحری جہازوں اور ۴۴ بارودی سرنگ بچھانے والے جہازوں کو نقصان پہنچایا یا تباہ کیا جاچکا ہے۔

ماہرین کے بقول امریکا اس وقت ہر اُس جگہ کو نشانہ بنا رہا ہے جہاں ان ہتھیاروں کے موجود ہونے کا امکان ہو، چاہے وہ غار ہو، عمارت ہو یا کوئی گیراج لیکن تمام خطرات کو مکمل طور پر ختم کرنا بہت مشکل ہے۔

اب ایک نئی حکمت عملی پر بھی غور کیا جا رہا ہے، جس کے تحت خصوصی فورسز یا میرینز کو قریبی جزائر پر تعینات کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ دشوار گزار علاقوں میں چھپے اہداف کی نشاندہی اور تباہی میں مدد دے سکیں۔

رپورٹس کے مطابق ایران کے اہم تیل برآمدی مرکز خارگ جزیرے یا آبنائے ہرمز کے قریب موجود تین متنازع جزائر پر قبضے پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ ان علاقوں میں فوجی موجودگی نہ صرف خطرات کی نگرانی میں مدد دے سکتی ہے بلکہ کم فاصلے کے فضائی دفاعی نظام نصب کر کے جہازوں کو تحفظ بھی فراہم کیا جاسکتا ہے۔

تاہم زمینی افواج کی تعیناتی خود ایک بڑا خطرہ ہے۔ یہ فوجی ایرانی توپ خانے، ڈرون حملوں اور دیگر ہتھیاروں کی زد میں ہوں گے، جبکہ ان کی رسد کے لیے مزید جہاز اور طیارے درکار ہوں گے جو خود خطرے میں ہوں گے۔

اس کے باوجود اس حکمت عملی کے فوائد محدود ہوسکتے ہیں کیونکہ ایران کے شاہد۔۱۳۶ ڈرونز ۱۵۰۰ کلومیٹر سے زائد فاصلے تک مار کر سکتے ہیں، یعنی وہ تقریباً کہیں سے بھی آبنائے ہرمز یا خلیج میں موجود اہداف کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔

بارودی سرنگوں کی صفائی بھی اتنی ہی پیچیدہ اور خطرناک ہوگی۔ اگرچہ اس بارے میں متضاد اطلاعات ہیں کہ ایران نے سرنگیں بچھائی ہیں یا نہیں مگر بحری کمپنیاں کسی بھی خطرے کا رسک لینے سے گریزاں ہیں۔

جنگ سے قبل اندازہ تھا کہ ایران کے پاس تقریباً ۶ ہزار مختلف اقسام کی بارودی سرنگیں موجود ہیں جن میں وہ سرنگیں بھی شامل ہیں جو پانی کی سطح کے قریب تیرتی رہتی ہیں اور جہاز سے ٹکرانے پر پھٹ جاتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ جدید سرنگیں بھی ہیں جو سمندر کی تہہ میں رہ کر جہاز کی آواز یا مقناطیسی اثر سے فعال ہوتی ہیں۔

تیل بردار جہازوں کو آبنائے ہرمز سے گزارنا اس پورے آپریشن کا سب سے پیچیدہ اور خطرناک مرحلہ ہوگا اور یہ ممکنہ طور پر طویل عرصے تک جاری رہ سکتا ہے۔

ایسے بحری قافلوں کے لیے درجنوں ڈرونز، حملہ آور ہیلی کاپٹر اور لڑاکا طیاروں کو مسلسل فضا میں نگرانی کرنی ہوگی جبکہ آنے والے میزائلوں اور ڈرونز کی بروقت نشاندہی کے لیے خصوصی نگرانی کے طیارے بھی درکار ہوں گے۔

جنگی جہاز کم فاصلے سے آنے والے خطرات کو ہلکی توپوں اور الیکٹرانک نظاموں کے ذریعے ناکارہ بنانے کی کوشش کریں گے جبکہ میزائلوں کے خلاف مہنگے اور محدود دفاعی میزائل استعمال کیے جائیں گے۔

ماہرین کے مطابق ہر دو تیل بردار جہازوں کے ساتھ کم از کم ایک ڈسٹرائر جنگی جہاز درکار ہوگا کیونکہ یہ جہاز آبنائے ہرمز کے نہایت قریب قریب گزریں گے۔

فی الحال اس خطے میں امریکا کے پاس ۱۴ ڈسٹرائر موجود ہیں مگر ان میں سے ۶ پہلے ہی طیارہ بردار جہازوں کی حفاظت پر مامور ہیں۔ مزید جہاز لانے میں ہفتوں لگ سکتے ہیں اور اس کے لیے امریکا کو دنیا کے دیگر علاقوں، خصوصاً ایشیا سے اپنے وسائل ہٹانا پڑیں گے۔

اگرچہ امریکا کے اتحادی اس حوالے سے مدد کرسکتے ہیں، لیکن زیادہ تر ممالک جنگ جاری رہنے کی صورت میں اپنے جہاز بھیجنے سے ہچکچا رہے ہیں۔ اس طرح کا مشن نہایت مہنگا بھی ہوگا اور امریکا اور اس کے اتحادیوں کے محدود دفاعی میزائل ذخائر کو مزید کم کردے گا۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۶ \\\\\\

عالمی بالادستی کا بھارتی خواب!

افتخار گیلانی

گزشتہ ۲۵ فروری کی شام جب یروشلم کے پرانے شہر کی فضاؤں میں مسجد اقصیٰ کے بلند پایہ میناروں سے اذان کی آواز کے ساتھ افطار کا اعلان ہو رہا تھا، تو اس سے چند سو میٹر کے فاصلے پر ایک صحن میں جہاں بھارتی ترنگا لہرا رہا تھا، انصاری خاندان کی نظریں اپنے ٹیلی ویژن سیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

اس جگہ سے محض ایک کلومیٹر کے فاصلے پر بھارتی وزیراعظم نریندر مودی اسرائیلی پارلیمان یعنی کنیسٹ میں خطاب کر رہے تھے۔

یہ خاندان تقسیمِ ہند سے قبل کے برصغیر کے اس تہذیبی نقشِ قدم کا امین اور پاسباں ہے جسے دنیا 'زاویہ الہندیہ' کے نام سے جانتی ہے۔

مقدس شہر یروشلم کے ہیرودس گیٹ یعنی بابِ زاہرہ سے چند ہی میٹر کے فاصلے پر واقع اس مقام کے مکینوں کو قوی امید تھی کہ شاید بھارتی وزیراعظم ان کے تاریخی صحن میں بھی قدم رنجہ فرمائیں گے۔ مگر مودی کی مصروفیات کچھ اور ہی تھیں، جس میں کسی بھی مسلم علامت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

زاویہ الہندیہ وہ نادر و نایاب مقام ہے جہاں برصغیر کے مسلمانوں کی روحانی تاریخ اور فلسطین ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ یہ صحن بارہویں اور تیرہویں صدی کے عظیم صوفی بزرگ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی یادوں سے منوّر ہے، جنہوں نے روایات کے مطابق یہاں چالیس روز تک چلّہ کشی اور اعتکاف کیا تھا۔

بابا فریدؒ کا مزارِ اقدس اگرچہ آج پاکستان کے صوبہ پنجاب کے شہر پاکپتن میں مرجع خلائق ہے، لیکن اسرائیل کے ساتھ پاکستان کے سفارتی تعلقات کی عدم موجودگی نے عملی طور پر ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت کو برصغیر کی اس عظیم مشترکہ میراث کا تنہا وارث اور نگراں بنا دیا ہے۔

سال ۱۹۹۲ء میں اسرائیل کے ساتھ باضابطہ سفارتی تعلقات کی بحالی کے چار سال بعد جب بھارت کے اُس وقت کے وزیر خارجہ پرنب مکھرجی نے یروشلم کا دورہ کیا تھا، تو انہوں نے اس خانقاہ میں حاضری دی تھی۔

تب سے آج تک اسرائیل اور فلسطین کا سفر کرنے والے تقریباً ہر بھارتی وزیر اور معزز شخصیت نے زاویہ الہندیہ کو اپنے شیڈول کا لازمی حصہ بنایا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ موجودہ وزیر خارجہ ایس جے شنکر بھی تین بار یہاں حاضری دے چکے ہیں۔ سفارتی حلقوں میں اسے اکثر یروشلم میں ایک 'بھارتی نگینہ' یعنی انڈین جویل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس کے ماتھے پر یہ عبارت درج ہے:

'یروشلم میں موجود بھارت میں خوش آمدید'

زاویہ الہندیہ کے موجودہ نگراں شیخ منیر حسن انصاری بتاتے ہیں کہ ان کے دادا، جن کا تعلق اتر پردیش سے تھا، کو ٹھیک سو سال قبل عثمانی ترکوں کے اس علاقے سے انخلا کے بعد اس صحن کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

یہ فیصلہ مفتیٔ اعظم فلسطین کی درخواست پر تحریکِ آزادی کے اکابرین جیسے ایم ایم انصاری اور مولانا محمد علی جوہر نے کیا تھا تاکہ یروشلم میں موجود برصغیر کی اس یادگار کی حفاظت کی جا سکے۔

مودی نے صرف یروشلم میں موجود اس 'بھارتی نگینے' کو نظر انداز نہیں کیا، بلکہ اس کے بجائے انہوں نے اپنا وقت اسرائیلی ٹیلی ویژن سیریز 'فوضیٰ' کے اداکاروں کے ساتھ گزارا اور اسرائیلی دفاعی افواج (آئی ڈی ایف) میں ان کے تجربات پر تبادلۂ خیال کیا۔

نئی دہلی واپسی سے قبل انہوں نے یروشلم میں ہولوکاسٹ میوزیم یدوشم کا دورہ بھی کیا۔

بھارت میں اس وقت مودی کے اس دورے کے وقت کے حوالے سے خاصی بحث ہو رہی ہے۔ کوئی یہ بتا نہیں پا رہا ہے کہ مودی نے اسرائیل کا یہ دورہ کیوں کیا، جبکہ باری ان کی نہیں بلکہ اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کی نئی دہلی آنے کی تھی۔

یہ سب اس حقیقت کو جاننے کے باوجود کیا گیا کہ ایران پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ان کے دورے کا بنیادی مقصد نیتن یاہو کو ان کی عالمی تنہائی سے نکالنے میں مدد فراہم کرنا تھا اور اپنے لیے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ سے سفارش کروانی تھی، جس نے تجارتی معاہدوں اور مودی کے دستِ راست صنعتکار اڈانی کا ناطقہ بند کیا ہوا ہے۔

مودی اُن گنے چنے چند سربراہانِ مملکت میں شامل ہیں جنہوں نے گزشتہ دو سالوں کے دوران اسرائیل کا سفر کیا ہے، جس دوران اسرائیل غزہ میں فلسطینیوں کی مسلسل نسل کشی میں مصروف رہا ہے۔

ان کی نئی دہلی واپسی کے محض ایک دن بعد ہی، اسرائیل نے امریکا کے ساتھ ایران کے خلاف نہ صرف اعلان جنگ کیا، بلکہ ایران کے سپریم لیڈر اور روحانی لیڈر آیت اللہ خامنہ ای سمیت کئی اعلیٰ سیاسی و فوجی رہنماؤں کو ہلاک کر دیا، جو عمان کی ثالثی میں طے پائے گئے امریکا کے ساتھ جوہری معاہدہ کے خدوخال کو آخری شکل دینے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

ان حملوں نے بھارت کے لیے سفارتی محاذ پر ایک ناگوار صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔ ایک وقت تھا کہ جب فروری ۱۹۷۹ء کو چین اور ویت نام کی جنگ چھڑ گئی تھی، تو بھارت کے اُس وقت کے وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی پیکنگ (موجودہ بیجنگ) کے سرکاری دورے پر تھے۔ بطور احتجاج وہ دورہ ادھورا چھوڑ کر نئی دہلی واپس لوٹے اور جنگ کے خلاف احتجاج بھی درج کروایا۔

بھارت نے ابھی تک ایران پر ہونے والے اس بلا اشتعال حملے کی مذمت بھی نہیں کی ہے، حالانکہ ایران کے ساتھ اس کے گہرے دو طرفہ تعلقات رہے ہیں۔ جب ۲۰۲۴ء میں ایرانی صدر ابراہیم رئیسی ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئے، تو بھارت میں ایک دن کے قومی ماتم کا اعلان کیا گیا اور وزیراعظم مودی نے اپنے بیان میں کہا کہ

'وہ ایرانی صدر کی ناگہانی موت سے بہت دکھی اور سوگوار ہیں اور بھارت ماتم کی اس گھڑی میں ایران کے ساتھ کھڑا ہے'

اب مبصرین یہ سوال کرتے ہیں کہ ۲۰۲۴ء اور ۲۰۲۶ء کے درمیان ایسا کیا کچھ ہو گیا کہ بھارت کے پاس ایران کے لیے ہمدردی کے دو بول بھی نہیں نکل سکے۔ اور تو اور وزارتِ خارجہ نے تمام سفارت خانوں کو باضابطہ ایک میمو کے ذریعے متنبہ کیا کہ ایرانی سفارت خانوں میں تعزیت پرسی کے لیے نہ جائیں۔

جب کانگریس اور دیگر اپوزیشن جماعتوں نے واویلا مچایا، تو سیکرٹری خارجہ وکرم مصری نے نئی دہلی میں مقیم ایرانی سفارت خانے جا کر تعزیتی رجسٹر پر دستخط کیے۔

پھر اسی ہفتے، بھارت کے دورے سے واپس جانے والے ایران کے ایک بحری جہاز کو امریکا نے بین الاقوامی پانیوں میں تارپیڈو سے نشانہ بنایا، جس کے نتیجے میں جہاز پر

سوار درجنوں افراد ہلاک ہوگئے۔ یہ جہاز غیر مسلح تھا اور امریکا۔اسرائیل کی ایران پر جنگ کے آغاز سے قبل بھارت کی دعوت پر 'انٹرنیشنل فلیٹ ریویو' میں شرکت کے لیے گیا تھا۔

سابق بھارتی فوجی افسران اور سفارت کاروں نے اس واقعے کو بھارتی حکومت کے لیے ایک تزویراتی شرمندگی اور اس کی علاقائی ساکھ کے لیے ایک دھچکا قرار دیا ہے۔

بھارت کے اس سرد ردعمل نے بھارتی لبرل طبقے اور اہم اپوزیشن جماعتوں کو حیران کر دیا ہے۔ آخر کار، ایران بھارت کے لیے محض ایک واقف کار نہیں تھا۔ بلکہ دہائیوں سے ایران کا شمار بھارت کے قریب ترین اتحادیوں میں ہوتا رہا ہے۔

بھارت، طویل عرصے سے خود کو بحرِ ہند میں سلامتی کے ضامن کے طور پر پیش کرتا رہا ہے۔ تشویش ناک پہلو یہ تھا کہ اس جہاز پر موجود عملہ کو بچانے کے لیے بھارت کے بجائے سری لنکا کی بحریہ حرکت میں آئی۔

بقول سینئر صحافی شیکھر گپتا 'آپریشن سیندور بھارت کے لیے ایک تلخ حقیقت بن کر سامنے آیا ہے۔ ان کے مطابق یکے بعد دیگرے پی ایس ایل وی کی دو ناکامیاں، عسکری صلاحیت کے حامل بیش قیمت سیارچوں کا زیاں، انٹیلی جنس اور نگرانی (آئی ایس آر) کے اپنے وسائل کی کمی، اور ایک نئے معرکے کی صورت میں اسٹینڈ آف ہتھیاروں، ڈرونز، سینسرز اور فضائی دفاع کی ناگزیر ضرورت یہ سب نوشتہ دیوار بن چکے ہیں اور اس کے لیے اسرائیلی مدد درکار ہے۔'

یہ بھی عیاں ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں بھارت اب ایک فریق بن چکا ہے، اور وہ فریق 'اسرائیل۔امارات گٹھ جوڑ' ہے۔ اس پس منظر میں ۱۹ر جنوری کو متحدہ عرب امارات کے حکمران شیخ محمد بن زاید (ایم بی زیڈ) کا تین گھنٹے کا اچانک اور پُراسرار دورہ نئی دہلی بھی اب سمجھ میں آتا ہے۔

اس صورتِ حال نے ان سوالات کو جنم دیا ہے کہ بھارت کس طرح اسرائیل کے ساتھ اپنی بڑھتی ہوئی شراکت داری اور مغربی ایشیا میں اپنے دیرینہ مفادات کے درمیان توازن برقرار رکھے گا، جہاں لاکھوں بھارتی برسرروزگار ہیں۔

اپنے خطاب میں مودی نے ویسے تو غزہ امن اقدام کی حمایت کی اور اعلان کیا کہ کوئی بھی پائیدار امن فلسطینی مسئلے کے حل کے بغیر ممکن نہیں، مگر ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ صرف کاغذ کی حد تک توازن پیدا کرنے کی کوشش تھی۔

فلسطینی رہنماؤں اور کئی اسرائیلی تجزیہ نگاروں نے بھی مودی کے دورے کو 'قبل از وقت' قرار دیا، جس کی تصدیق ایران پر حملے سے ہوگئی، کیونکہ اب یہ دورہ ان حملوں کی خاموش تائید معلوم ہوتا ہے۔

فلسطینی مصنف اور سماجی کارکن احمد اریتما کا استدلال ہے کہ ایک دانش مندانہ طریقہ کار یہ ہوتا کہ غزہ میں جنگ بندی کے مستحکم ہونے اور انسانی ہمدردی کی راہداریوں کے فعال ہونے کا انتظار کیا جاتا، نہ کہ ایسے وقت میں دورہ کیا جاتا جب خطہ ایک فعال میدانِ جنگ میں تبدیل ہونے والا تھا۔

موجودہ صورتِ حال نے بھارت کے گلوبل ساؤتھ کے لیڈر کے دعوے کی بھی پول کھول کر رکھ دی۔

بھارت کے لیے ایران یا سعودی عرب سے کھلی دشمنی مول لینا ایک پیچیدہ اور مہنگا سودا ہوگا۔ بھارت نے تاریخی طور پر ایران کے ساتھ تعلقات برقرار رکھے ہیں اور چابہار بندرگاہ جیسے منصوبوں میں سرمایہ کاری کی ہے۔

اسرائیل کے ساتھ گہری تزویراتی وابستگی نئی دہلی پر دباؤ بڑھا سکتی ہے کہ وہ ایران مخالف محور کا حصہ نہ بنے۔ اب تہران کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے کی قیمت بڑھ سکتی ہے، اور بھارت کی مغربی ایشیا پالیسی کو 'ملٹی الائنمنٹ' کے بجائے اسرائیل کی طرف بتدریج منتقلی کے طور پر دیکھا جائے گا۔

فلسطینی رہنما احمد مجدلانی یاد دلاتے ہیں کہ بھارت، اسرائیل میں اپنی ساکھ کو امن کے لیے اسی طرح استعمال کر سکتا تھا جیسے ۸۰ کی دہائی کے اوائل میں ناروے نے کیا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں جب ناروے میں تیل کے ذخائر دریافت ہوئے، تو اس پر اسرائیل کو تیل فراہم کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا، لیکن نارویجن وزیراعظم نے جب یاسر عرفات سے مشورہ کیا، تو بتایا جاتا ہے کہ فلسطینی لیڈر نے ایک عملی موقف اختیار کر کے ناروے کو بتایا کہ وہ اس پوزیشن کو استعمال کر کے اسرائیل کو فلسطینیوں کے ساتھ پسِ پردہ مذاکرات پر مجبور کر دے۔

یہی کوششیں چودہ سال بعد 'اوسلو معاہدے' پر منتج ہوئیں، جہاں دو ریاستی فارمولے کو پذیرائی ملی اور عرفات کی فلسطین واپسی ہوئی اور مغربی کنارہ اور غزہ کو اسرائیل سے خالی کر دیا گیا۔

تجزیہ کاروں کو کا کہنا ہے کہ بھارت کا سیاسی وزن ناروے سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں تمام فریقین سے بات کرنے کی صلاحیت ہے، بشرطیکہ وہ اپنی علامات کا انتخاب احتیاط سے کرے۔

آخر کار، سفارت کاری صرف معاہدوں سے نہیں بلکہ اُن جگہوں سے بنتی ہے جہاں ایک لیڈر دورہ اور تقریر کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

زاویہ الہند یہ کو نظر انداز کر کے کنیسٹ کو اوّلیت دینا کسی ایسے رہنما کا اشارہ نہیں تھا جو پائیدار امن، فلسطینی وقار یا گلوبل ساؤتھ کی لیڈرشپ کے لیے کوشاں ہو۔

بھارت نے غزہ میں جنگ بندی کی قرارداد کو فوری طور پر قبول نہیں کیا اور ہتھیاروں کی پابندی کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا، یہ کہتے ہوئے کہ وہ اسرائیل کے ساتھ اپنے ہتھیاروں کے سودوں پر نظرثانی کرنے سے پہلے اپنے قومی مفاد کو مدنظر رکھے گا۔

مختصراً یہ کہ، اس جنگ میں بھارت کی عالمی حیثیت بری طرح متاثر ہوگئی ہے۔ شیکھر گپتا، جو کئی برسوں سے مودی کی مدح سرائی میں مصروف تھے، بھی اب بتا رہے ہیں کہ بھارت اپنی بڑائی کے اس نشے میں دھت تھا۔ اس نے مان لیا تھا کہ وہ ایک ابھرتی ہوئی اور ناگزیر عالمی طاقت ہے اور اسی خمار میں اس کے رہنما پچھلی ایک دہائی سے جی رہے تھے اور یہی سبق اپنی قوم کو میڈیا کے ذریعے پڑھا رہے تھے۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۱ر مارچ ۲۰۲۶ء)

حج وعمرہ کی سعادت حاصل کرنے والوں کے لیے
اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی راہنما کتاب

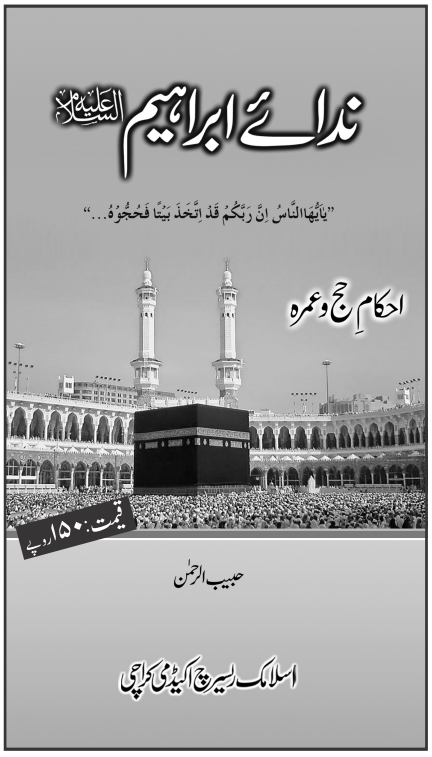

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

صرف ’ہرمز‘ عالمی تجارت کا نازک مقام نہیں!

وکٹورین عہد کے ایڈمرل سر جیکی فشر نے کہا تھا کہ پانچ اسٹریٹجک چابیاں ایسی ہیں جو دنیا کو مقفل کر دیتی ہیں۔ اُن کا اشارہ اُن نازک اور حساس مقامات کی طرف تھا جو بڑی کاروباری بحری راہداریوں کی طرف تھا۔ اِن میں سنگاپور، کیپ ٹاؤن، الیگزینڈریا، جبرالٹر اور ڈوور شامل تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس فہرست میں آبنائے ہرمز کو بھی ضرور شامل کرتے کیونکہ اِس راہداری سے بھی دنیا کی اچھی خاصی تجارت ہوتی ہے اور اِس تجارت کو کنٹرول کرنے کی سکت ایران میں ہے۔ ایران اس سکت کو بروئے کار بھی لا رہا ہے۔ ایران نے آبنائے ہرمز بند کر کے عالمی تجارت کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔ خلیج کے خطّے سے دنیا بھر کے لیے عالمی ذخیروں کا بیس فیصد تیل اور قدرتی گیس آبنائے ہرمز کے ذریعے بھیجی جاتی ہے۔ آبنائے ہرمز کی بندش سے دنیا بھر کی معیشتیں مشکلات محسوس کر رہی ہیں۔ اور یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ آبنائے ہرمز بحری تجارت کے حوالے سے دنیا کا حساس ترین مقام نہیں ہے۔ ایک زمانے سے دنیا بھر کے ممالک بحری تجارت میں رکاوٹوں کے خاتمے کے لیے کوششیں کرتے آئے ہیں۔ صدیوں پہلے بھی بہت سے ملک سمندری راستوں میں رکاوٹ کھڑی کر کے بین الاقوامی تجارت پر اثر انداز ہوتے تھے۔ اب پھر ویسی ہی کیفیت پیدا ہو چلی ہے۔ طاقتور ممالک بھی اس صورتِ حال میں شدید مشکلات محسوس کر رہے ہیں۔

امریکی تھنک ٹینک سینٹر فار میریٹائم اسٹریٹجی کے اسٹیون وِلز کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں لوگوں کو بہت تیزی سے یہ احساس ہو چلا ہے کہ دنیا بھر کی معیشتوں کو متحرک رکھنے کے لیے بحری تجارت ناگزیر ہے اور یہ کہ اِس تجارت کی راہ مسدود کرنے سے عالمی تجارت اور مالیاتی نظام کو شدید دھچکا لگے گا۔ سبھی کو اندازہ ہے کہ اب بحری تجارت کا بہاؤ سلامت رکھنے کے اقدامات کرنا ہی ہوں گے۔ پائپ لائنز بھی ہیں، طیارے بھی ہیں، گاڑیاں بھی ہیں، ٹرینیں بھی ہیں مگر پھر بھی عالمی برآمدات کا ۸۵ فیصد اب بھی بحری راستوں ہی سے ممکن ہے۔ یہ درست ہے کہ عالمی تجارت کا اہم حصہ طیاروں کے ذریعے بھیجا جاتا ہے مگر پھر بھی بہت بڑے پیمانے پر کمتر درجے کی اشیا کی ترسیل کے لیے سمندری راستوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی سبب ہے کہ بحری تجارت کو لاحق خطرات سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ٹیکنالوجی سستی ہوگئی ہیں اور اُن تک ہر ایک کی رسائی بھی ممکن ہو چکی ہے۔ بہت سے عسکریت پسند گروپ اور بالخصوص کسی ملک کے لیے ’’خدمات‘‘ انجام دینے والے گروہ جدید ترین ٹیکنالوجی کو بروئے کار لاتے ہوئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ ایشیا اور یورپ کے درمیان باب المندب سے گزر کر تجارتی مال لے جانے والے جہازوں کو یمن کی حوثی ملیشیا نے پریشان کر رکھا ہے۔ اِس سے پہلے اِن جہازوں کو صومالیہ کے ڈکیت گروپوں (بحری قزاقوں) کا سامنا رہتا تھا۔ یہ سمندری ڈاکو مال بھی لوٹتے تھے اور جہازوں کے عملے کو یرغمال بھی بناتے تھے۔ ۲۰۲۳ء سے ۲۰۲۵ء کے دوران حوثی ملیشیا نے ڈرون اور میزائل حملے کیے جن سے بحری تجارت بُری طرح متاثر ہوئی۔ بہت سے تجارتی ادارے اپنا مال خاصا لمبا چکر کاٹ کر منزل تک پہنچاتے ہیں۔ وہ سمندری ڈاکوؤں اور حوثی ملیشیا کے ہاتھوں پہنچنے والے نقصان سے عاجز ہو چکے ہیں۔ باب المندب سے کبھی عالمی تجارت کا ۹ فیصد مال گزرا کرتا تھا۔ اب یہ حجم صرف ۴ فیصد رہ گیا ہے۔ اور اگر حوثی ملیشیا نے ایران سے یکجہتی کے اظہار کے لیے حملے شروع کر دیے تو باب المندب سے گزارے جانے والے تجارتی مال کا حجم مزید گھٹ جائے گا۔

عالمی تجارت کے لیے نیا خطرہ قریبی سمندروں میں چھڑنے والی لڑائی کے ہاتھوں پیدا ہوا ہے۔ یوکرین پر روس کی لشکر کشی نے بحیرۂ اسود کے راستے اناج، تیل اور دیگر اہم اشیا کی ترسیل کو شدید متاثر کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں آبنائے باسفورس اور ڈارڈینیلیز نامی آبی گزرگاہوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ان بحری راستوں پر ایران کا کنٹرول ہے۔ ایران کے خلاف امریکا اور اسرائیل کی جنگ کے ہاتھوں اب خلیجِ فارس کا پورا خطہ شدید عدم توازن کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اگر کہیں ایسے میں تائیوان کے معاملے پر امریکا اور چین کے درمیان مناقشہ عملی تصادم کی شکل اختیار کر گیا تو سمجھئے عالمی امن داؤ پر لگ ہی جائے گا۔ دو عالمگیر جنگوں کے دوران بہت سے سمندری راستے بند ہو گئے تھے یا کر دیے گئے تھے۔ اگر امریکا اور چین آمنے سامنے آئے تو ویسی ہی صورتِ حال پھر پیدا ہوسکتی ہے اور اس کے نتیجے میں عالمی تجارت داؤ پر لگے گی اور درجنوں معیشتیں انتہائی نوعیت کے عدمِ توازن کا شکار ہو جائیں گی۔ امریکا کی ایک آبدوز نے حال ہی میں ایران کے ایک جنگی جہاز کو ڈبویا ہے۔ یہ ۱۹۴۵ء کے بعد اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے۔

ماحول میں رونما ہونے والی تبدیلی کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ خشک سالی کے ہاتھوں پانامانہر میں جہاز رانی حالیہ برسوں میں انتہائی دشوار ثابت ہوئی ہے۔ اِس کے نتیجے میں بہت سے جہازوں کو کیپ ہارن سے گھوم کر جانا پڑتا ہے۔ بحیرۂ آرکٹک برف تیزی سے پگھل رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں نئے شپنگ روٹ شروع ہوسکتے ہیں اور آبنائے بیرنگ جیسی دور افتادہ بحری راہداریوں کی اہمیت بڑھ سکتی ہے۔ امریکا کے توسیع پسند صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ دنیا بھر کے بحری تجارتی راستوں کی سکیورٹی بڑھائی جائے۔ وہ پانامانہر اور گرین لینڈ کو کنٹرول کرنے کی بات بھی کر چکے ہیں۔ اگر ایران نے آبنائے ہرمز کھول دی تب بھی دنیا بھر میں ایسی کم و بیش ۱۲ راہداریوں کو نئے سکیورٹی نظام کے ماتحت کر دیا جائے گا۔

قدیم زمانوں ہی سے بحری تجارتی راہداریوں اور چیک پوائنٹس کی اہمیت غیر معمولی نوعیت کی رہی ہے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں لڑی جانے والی پیلوپونیسین جنگ کے دوران ڈارڈینیلز نے اسپارٹا پر قبضہ کر لیا تھا۔ اِس کے نتیجے میں بحیرۂ اسود سے اناج کی ترسیل میں شدید رکاوٹ پیدا ہوئی تھی۔ خوراک کی شدید قلت نے ایتھنز کے باشندوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ اور اُس کے اتحادیوں نے اِسی راستے کو بند کر کے سلطنتِ عثمانیہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ عسکری مہم (جو گیلیپولی کیمپین کہلاتی ہے) شدید ناکامی سے دوچار ہوئی تھی اور اِس پر خرچ بھی بہت آیا تھا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ٹیکنالوجی نے حیرت انگیز حد تک ترقی کی ہے۔ طیاروں، میزائلوں اور مواصلاتی سیاروں کے اِس دور میں بھی جغرافیہ بہرحال اپنی جگہ ہے۔ بہت سے بحری چیک پوائنٹس سے جدید ترین طریقوں سے تیار کردہ مال ایشیا کے کارخانوں سے نکل کر باقی دنیا تک پہنچتا ہے۔ ان بحری چیک پوائنٹس میں آبنائے تائیوان اور آبنائے ملاکا بہت اہم ہیں۔ بحیرۂ بالٹک اور شمالی سمندروں کو ملانے والے بحری چیک پوائنٹس میں جبرالٹر، رودبارِ انگلستان، کیٹیگیٹ، اسکاگریک اور اوریسنڈ نمایاں ہیں۔ نہرِ سوئز اور نہرِ پانامانا

انسانوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ یہ دو عظیم خطوں کو باہم ملانے والے معروف شارٹ کٹ ہیں۔ اس صورت میں تجارتی مال کی لاگت میں بھی کمی واقع ہوتی ہے۔ آبنائے ہرمز ایشیا اور یورپ کے لیے توانائی کے حصول کا اہم ذریعہ ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ آبنائے ہرمز دنیا کی مصروف ترین بحری راہداری ہے یا اس کے ذریعے دنیا کا سب سے زیادہ تیل گزرتا ہے۔ یہ اعزاز آبنائے ملاکا کو حاصل ہے۔ ہاں، آبنائے ہرمز خلیج کے خطے سے نکلنے کا واحد راستہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے بند کیے جانے سے پورے خلیج کے تیل کی ترسیل رک جاتی ہے۔ یہی معاملہ ترکی اور ڈنمارک میں سے ہر ایک کے سمندری چیک پوائنٹس کا بھی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ مالِ تجارت لے جانے والے جہازوں کو متبادل روٹ نہیں مل سکتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ متبادل روٹ اختیار کریں تو ایک طرف ترسیل میں تاخیر بہت ہوتی ہے اور دوسری طرف اخراجات میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے۔ 'دی اکنامسٹ' نے جب دنیا بھر کی بندرگاہوں تک پہنچائے جانے والے تجارتی مال کے لیے متبادل روٹس کے بارے میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ایسی صورت میں عالمی تجارت کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے کیونکہ تاخیر کے باعث دنیا بھر میں لاکھوں کارخانے ڈھنگ سے کام نہیں کر پائیں گے۔ لاکھوں افراد کا روزگار متاثر ہوگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تجارتی مال کی لاگت میں انتہائی پریشان کن حد تک اضافہ ہو جائے گا۔ آبنائے ملاکا کو، جہاں سے بہت بڑے پیمانے پر تجارتی مال گزرتا ہے، اگر بند بھی کر دیا جائے تو جہازوں کو بہت زیادہ گھوم پھر کر جانا نہیں پڑے گا۔ اگر انڈونیشیا نے امریکا اور چین کے درمیان جنگ چھڑنے کی صورت میں فریق بننا پسند کیا اور اپنی بحری راہداریاں بند کر دیں تو کارگو جہازوں کو بہت گھوم پھر کر اپنی منزل تک پہنچنا پڑے گا، اس لیے ایسی کسی بندش سے بہت زیادہ خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی طور اگر جبرالٹر (جبل الطارق) کے چیک پوائنٹ کو بند کر دیا جائے تو تجارتی جہازوں کو بہت بڑا پھیرا لگا کر اپنی اپنی مقررہ بندرگاہوں تک پہنچنا پڑے گا۔

اگر کوئی جہاز امریکا کے شہر لاس اینجلس سے روانہ ہو اور ٹوکیو، بوسان، شنگھائی، سنگاپور، دبئی، راٹرڈیم اور نیویارک سے ہو کر واپس لاس اینجلس پہنچے تو سمجھ لیجیے اُسے کم و بیش پوری دنیا کا چکر کاٹنا پڑے گا۔ مشرقِ وسطیٰ عالمی تجارت کے اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی بندش کو کسی بھی طور برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

ارضیات نے خلیجِ فارس کے خطے کو تیل اور گیس کی دولت سے نوازا ہے۔ یہ علاقہ یوریشیا کے نیچے عربین ٹیکٹونک پلیٹس کی شکل میں واقع ہے۔ تاریخ نے اس خطے کو اہم بنا دیا ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد خطے کی عرب ریاستوں میں شدید عدمِ استحکام پیدا ہوا، اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان تنازع نے معاملات کو مزید الجھا دیا۔ رہی سہی کسر نام نہاد اسلامی عسکریت پسند گروہوں نے پوری کر دی۔ پورے خطے کا امن جنگوں، اندرونی شورشوں اور بیرونی مداخلت کے ہاتھوں یرغمال رہا ہے۔ عرب اسرائیل رقابت کے باعث نہرِ سوئز برسوں بند رہی۔ ۱۹۷۹ء سے ایران میں اسلامی شدت پسند طرزِ حکومت قائم ہے جس نے آبنائے ہرمز کے شمالی کناروں کو کنٹرول کر رکھا ہے اور اس کے نتیجے میں خلیجِ فارس کے خطے میں بار بار بحران سر اٹھاتے رہے ہیں۔

خلیجِ فارس کے خطے سے روانہ ہونے والے بیشتر آئل ٹینکر آبنائے ملاکا کا رخ کرتے ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں اس وقت کے چینی صدر ہو جنتاؤ نے آبنائے ملاکا کا معاملہ اٹھایا۔ اس اہم چیک پوائنٹ سے چین کی طلب کا ۸۰ فیصد تیل گزرتا تھا۔ انہوں نے امریکا کا نام لیے بغیر کہا کہ بعض بڑی طاقتیں چین کو تیل کی سپلائی روکنے کے لیے آبنائے ملاکا کے خطے میں کشیدگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انہوں نے چین کو لاحق وسیع تر خطرات کا ذکر کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ چین کو سیکڑوں یا ہزاروں جزائر پر مشتمل ممالک کی طرف سے رکاوٹیں کھڑی کیے جانے کے خدشے کا سامنا ہے۔ چین کے لیے انڈونیشیا اور جاپان بھی ایسے ہی ممالک ہیں۔

ہم اس وقت آبنائے ہرمز کو رو رہے ہیں جبکہ آبنائے تائیوان بھی انتہائی حساس مقام ہے۔ اگر یہ بحری راہداری بند کر دی گئی تو امریکا اور چین آمنے سامنے آ سکتے ہیں۔ چین آج بھی تائیوان کو اپنا باغی صوبہ قرار دیتا ہے۔ عالمی ضرورت کے ۹۰ فیصد جدید ترین سیمی کنڈکٹرز تائیوان کے کارخانے تیار کرتے ہیں۔ چین کے صدر شی جن پنگ نے اپنی افواج کو حکم دے رکھا ہے کہ ۲۰۲۷ء تک تائیوان کو فتح کرنے کی تیاری کریں۔ تائیوان کی ساری مزاحمت امریکا کی شہ پر ہے۔ اگر امریکا نے اُس کے دفاع کی ذمہ داری پوری نہ کی تو چین کے لیے راستہ بالکل صاف ہو جائے گا اور اگر امریکا آگے بڑھا تو ایک بڑی جنگ بھی ہو سکتی ہے۔

سوال محض خدشات کا نہیں۔ چین نے اپنی بحریہ کی توسیع بھی شروع کر دی ہے۔ وہ اپنی بحریہ کو جدید ترین اسلحے سے لیس کر رہا ہے تاکہ گہرے سمندروں میں زیادہ آسانی کے ساتھ جنگ لڑی جا سکے۔ چینی بحریہ کو اپنے ساحلوں اور اپنے پانیوں سے بہت دور بھی لڑنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ دوسری طرف، چین کے عزائم کو بھانپتے ہوئے، آسٹریلیا، جاپان اور فلپائن نے بھی معیاری دفاعی تیاریاں تیز کر دی ہیں۔ وہ مل جل کر کام کرنے پر بھی توجہ دے رہے ہیں۔

چین نے میانمار اور خلیج بنگال کے ذریعے روس اور وسط ایشیا کے ممالک سے تیل اور گیس کے حصول کے لیے نئے روٹس پر کام شروع کر دیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آبنائے ملاکا پر زیادہ انحصار نہ کیا جائے۔ چینی صدر شی جن پنگ نے ۲۰۱۲ء میں منصبِ صدارت سنبھالنے کے بعد بیلٹ اینڈ روڈ منصوبہ شروع کیا تھا جس کے تحت دنیا بھر میں بندرگاہیں، سڑکیں اور ریلوے ٹریک بنانے پر خطیر سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ افریقا میں بھی چین کا اثر و رسوخ زیادہ ہے۔ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے ذریعے جو بنیادی ڈھانچا کھڑا کیا گیا ہے، وہ جنگ کی صورت میں چین کے لیے سپلائی لائن کا کام کرے گا۔ چین نے ڈیڑھ عشرے کے دوران بحیرہ جنوبی چین میں متعدد فوجی اڈّے بھی قائم کیے ہیں۔ ۲۰۱۷ء میں چین نے اپنا پہلا سمندر پار فوجی اڈا افریقی ملک جبوتی میں کھولا۔ وہ روس کے شمالی ساحلوں سے ہو کر بحیرہ منجمد شمالی کے روٹ پر بھی کام کرتا رہا ہے۔

اب تک یہ واضح نہیں کہ یہ تمام کوششیں چین کی ہدف پذیری کو کس حد تک کم کر سکتی ہیں۔ چینی حکومت نے حالیہ چند برسوں کے دوران بحری تجارت کو لاحق ممکنہ نئے خطرات کے بارے میں بھی تحقیق کروائی ہے تاکہ نئے چیک پوائنٹس یا فلیش پوائنٹس کی بروقت نشاندہی ہو سکے۔ اہم شخصیات ایسے تمام خطرات سے بروقت نپٹنے سے متعلق اقدامات پر زور دے رہی ہیں۔ دی چائنا الیکٹرسٹی کاؤنسل کے ژو یاؤ کیانگ کہتے ہیں کہ ایران جنگ توانائی کے حوالے سے چین کے لیے ایک بڑا ممکنہ خطرہ ہے۔ آبنائے ہرمز جیسے چیک پوائنٹس کو بہت آسانی سے بند کیا جا سکتا ہے، اس لیے چین کو توانائی کے حصول میں غیر معمولی مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے۔ ایسے میں لازم ہے کہ ممکنہ خطرات کا سامنا کرنے کی بھرپور تیاری کی جائے۔ 'پیپلز ڈیلی' کے لیے ایک مضمون میں ژو یاؤ کیانگ نے لکھا ہے کہ چین کو امن کے زمانے کی ذہنیت ترک کرتے ہوئے ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جن کے ذریعے سپلائی

لائن کو ہر حال میں برقرار رکھنا ممکن ہو۔ پاکستان تک پائپ لائن تعمیر کی جائے، کُھلے سمندروں میں تجارتی مال کی ترسیل جاری رکھنے کے لیے غیر معمولی سکیورٹی اقدامات کیے جائیں اور کسی بھی ہنگامی صورتِ حال سے نپٹنے کی پوری تیاری کی جائے۔ چند ایک ماہرین نے تو محدود پیمانے پر دفاعی اقدامات بھی تجویز کیے ہیں تاکہ امریکا سمیت کوئی بھی چین کے لیے بڑے خطرے میں تبدیل نہ ہو سکے۔

آبنائے ملاکا میں بحری قذاقی روکنے کے لیے انڈونیشیا، ملائیشیا، سنگاپور اور تھائی لینڈ مل کر گشت کرتے ہیں۔ بحری راستوں کے حوالے سے پائی جانے والی قدیم رقابت آج بھی غیر معمولی سکیورٹی خدشات پیدا کر رہی ہے۔ کسی بھی بڑے مناقشے یا جنگ کی صورت میں یہ بحری راستے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں، اِس پر بھی بہت بحث ہو رہی ہے۔ امریکا یا چین کو کسی بھی بڑی جنگ کی صورت میں آبنائے ملاکا، سُنڈا اور لمبوک جیسے اہم چیک پوائنٹس کی بندش سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ یہ سوال بھی بہت اہم ہے کہ کون کس کے ساتھ ہوگا یا ہو سکتا ہے۔ چین نے جنوب مشرقی ایشیا میں کمبوڈیا اور میانمار جیسے ممالک سے دوستی مضبوط بنانے پر توجہ دی ہے کیونکہ یہ بہت حد تک اُس کی کلائنٹ ریاستیں ہیں۔ چین ضرور چاہے گا کہ خطے کے مزید ممالک سے اُس کے تعلقات مزید بہتر ہوں تاکہ اُس کے لیے سکیورٹی خدشات میں کمی واقع ہو سکے۔ اِس وقت کیفیت یہ ہے کہ خطے کے بیشتر ممالک اُس کے لیے خطرے کا درجہ رکھتے ہیں یا کسی بھی نازک وقت میں مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔

امریکا نے چین کو منہ دینے کے لیے بھارت کو آگے کیا ہے۔ اُس نے آبنائے ملاکا میں چین کے تجارتی اور جنگی جہازوں کی نشاندہی ممکن بنانے کے لیے بھارت کو تکنیکی مدد فراہم کی ہے۔ چند برسوں کے دوران بھارتی قیادت امریکا اور اسرائیل کی طرف زیادہ جھکی ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایران کے خلاف جنگ کے چھیڑے جانے سے خود بھارت کے لیے بھی توانائی کا بحران ایک معقول حد تک تو پیدا ہوا ہے۔

یہ بھی بہت حد تک ممکن ہے کہ بھارت نئی دوستیاں پروان چڑھائے یا پرانی دوستیوں کو بحال کرے۔ چین کو پرے رکھنے کے لیے وہ روس کے نزدیک رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُس نے پاکستان کو منہ دینے کے لیے ایران کا ساتھ دینے کی حکمتِ عملی اختیار کی ہوئی ہے۔ ایران کی بندرگاہ چابہار میں بھارت نے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ہے۔ ہاں، جنگ کے وقت اسرائیل کی حمایت کر کے اور امریکا کی طرف زیادہ جھک کر اُس نے ایران کو ناراض کیا ہے۔ وہ چابہار کی بندرگاہ کے ذریعے وسطِ ایشیا تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایران نے بھارت کے لیے تیل اور تجارتی سامان لے جانے والے جہازوں کو بھی خلیج کے خطے سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔

دوسری طرف یورپ نے مغربی علاقے میں روس کو پیچھے دھکیلنے کے لیے یوکرین کی مدد جاری رکھی ہے۔ یورپی یونین نے روسی تیل اور گیس کا بائیکاٹ کیا ہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ کریملن نے ایشیائی ممالک کے لیے تیل اور گیس کی سپلائی بڑھا دی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ غیر معمولی اور پُرکشش ڈسکاؤنٹ بھی دے رہا ہے۔ اس عمل میں روس کو نیٹو کے رکن ممالک سے بات چیت کر کے چند اہم چیک پوائنٹس سے گزرنے کی آسانی یقینی بنانی پڑی ہے۔ اس حوالے سے ترکی اور ڈنمارک سے مذاکرات کی بہت اہمیت ہے۔ روس کی ۲۰ اور ۳۰ فیصد تیل کی برآمدات بالترتیب ترکی اور ڈنمارک کے ذریعے بھیجی جاتی ہیں۔ روس اپنے بہت سے تجارتی جہازوں کو غلط پرچم لگا کر بھی روانہ کرتا ہے۔ یورپی ممالک نے ایسے چند جہازوں کو پکڑا ہے۔

جب روس نے بحیرۂ اسود میں اوڈیسا اور یوکرین کی دیگر بندرگاہوں کو بلاک کیا تھا تب یوکرین سے اناج کی ترسیل تقریباً مکمل طور پر رک گئی تھی۔ اِس کے نتیجے میں عالمی منڈی میں اناج کی قیمت بڑھ گئی تھی اور یوکرین کو اناج کی ترسیل جاری رکھنے کے لیے محفوظ متبادل بحری راستے تلاش کرنا پڑے تھے۔ تجارتی جہازوں پر اِکا دُکا حملے اب بھی ہوتے رہتے ہیں۔ سمندری راستوں پر بچھائی جانے والی بارودی سرنگیں تجارتی جہازوں کے لیے اب بھی خطرہ بنی ہوئی ہیں۔ ترکی نے اپنی اہم بحری راہداریوں کو جنگی جہازوں کے لیے نہیں کھولا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ روس اپنے بحیرۂ اسود کے بحری بیڑے کو مضبوط کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے جسے یوکرینی فوج کے ہاتھوں غیر معمولی نقصان پہنچا تھا۔

ترک صدر رجب طیب ایردوان اب کینال استنبول کے زیرِ عنوان نیا منصوبہ شروع کر سکتے ہیں تاکہ آبنائے باسفورس پر پڑنے والے جہاز رانی کے دباؤ کو کم کرنے میں مدد مل سکے۔ اب ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا یہ منصوبہ ۱۹۳۶ء کے مانٹراکس کنونشن کے ماتحت ہوگا۔ یہ کنونشن بحری راستوں پر تجارتی اور جنگی جہازوں کی آمد و رفت کو منظّم کرتا ہے۔ اس دوران بحیرۂ بالٹک نیٹو کے تالاب میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یوکرین جنگ کے نتیجے میں سوئیڈن اور فن لینڈ نے نیٹو میں شمولیت اختیار کی ہے تاکہ اپنا مؤثر دفاع ممکن بنا سکیں۔ اِس کے باوجود روس اور یوکرین کی طرف سے سمندر میں بنیادی ڈھانچے کو نشانہ بنانے کا عمل روکا نہیں جا سکا ہے۔ گیس پائپ لائنوں کے ساتھ ساتھ مواصلات کے لیے بچھائے جانے والے کیبلز کو نقصان پہنچانے کا عمل بھی جاری ہے۔

بحرِ اوقیانوس کے خطے میں پاناما نہر بھی اہم ہے مگر بہت زیادہ نہیں۔ یہاں سے بحری تجارت کا صرف تین فیصد حصہ وابستہ ہے۔ اس نہر سے امریکا کے جنگی جہازوں کو بحرِ اوقیانوس اور بحرالکاہل کے درمیان سفر کی اجازت ہے۔ امریکا کی ۴۰ فیصد کنٹینر ٹریفک پاناما نہر کے ذریعے ہوتی ہے۔ پاناما نہر کو چلانے کی ذمہ داری پاناما کی حکومت نے ہانگ کانگ میں رجسٹرڈ ایک چینی کمپنی کو سونپ رکھی تھی۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کہتے رہے ہیں کہ پاناما نہر کا پورا کنٹرول امریکا کے حوالے کیا جائے۔ امریکی دباؤ کے تحت پاناما کی حکومت نے اس اہم بحری راستے کا کنٹرول دو یورپی اداروں کے حوالے کرنے سے متعلق اقدامات کیے ہیں۔ پاناما کے صدر ہوزے رال مولینو کہتے ہیں کہ بحران ختم ہو چکا ہے مگر چین نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پاناما کو سیاسی اور معاشی دونوں اعتبار سے غیر معمولی فائدہ پہنچائے گا۔ اس دوران نکاراگوا نے بھی پاناما نہر کی ٹکر پر ایک نہر کھودنے کی بات کی ہے۔

بہت سے ممالک اب اس فکر میں ہیں کہ کسی بھی بڑی جنگ کی صورت میں اپنے بحری راستوں کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنائیں۔ ساتھ ہی ساتھ بہت سے ملک تجارتی مال کی درآمد و برآمد سہولت جاری رکھنے کے لیے بھی فکرمند ہیں اور متبادل بحری راستے تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ قابلِ تجدید توانائی کے ذرائع کو پروان چڑھانے کے لیے کوشاں ہیں تاکہ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں اپنے آپ کو ناموافق کیفیت سے زیادہ سے زیادہ دُور رکھ سکیں۔ ایسے کسی بھی منصوبے کو عملی شکل اختیار کرنے میں کئی برس لگ سکتے ہیں۔ اگر ایران جنگ جاری رہی تو بہت سے ملکوں کو گلوبل لاجسٹکس نیٹ ورکس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرنا ہی پڑے گی۔

خلیجِ فارس کی ریاستوں کو ایران جنگ کے باعث تجارتی مال کی ترسیل ممکن بنائے رکھنے کے لیے متبادل راستے تلاش کرنا پڑے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں اخراجات بڑھ گئے ہیں

اور چیزیں مہنگی ہوگئی ہیں۔ زمینی راستوں سے بھی مال منگوایا جارہا ہے مگر یہ بہت مہنگا پڑتا ہے اور ایسے مال کا حجم بہت کم ہے۔ فجیرہ کی بندرگاہ پر غیر معمولی ٹریفک جام کی خبریں ہیں۔ جہازوں کے لیے استعمال کیے جانے والے تیل کی قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔ یہ اضافی اخراجات حتمی صارفین تک منتقل کیے جارہے ہیں۔ سیٹیلائٹ ڈیٹا سے معلوم ہوا ہے کہ مارچ کے دوران بحری راستوں پر ٹریفک ۲ فیصد سست رفتار رکھی گئی ہے تاکہ ایندھن بچایا جاسکے۔

خلیج کے خطے میں اس وقت ۳۰۰ سے زائد آئل ٹینکر پھنسے ہوئے ہیں۔ اُن کے متبادل راستے بھی تلاش کیے جارہے ہیں۔ چارٹرنگ کے اخراجات بھی ۱۰ر فیصد تک بڑھ چکے ہیں۔ آبنائے ہرمز کی بندش سے بحری تجارت کو شدید دھچکا لگا ہے۔ تیل کی سپلائی رکنے سے کئی ملکوں کے لیے توانائی کا بحران پیدا ہوا ہے۔

ایک صدی کے دوران بحری تجارت بہت حد تک خطرات سے دور رہی ہے۔ دنیا بھر کے ممالک بحری راستوں کو پوری ہم آہنگی کے ساتھ استعمال کرتے آئے ہیں۔ اگر بحری راستوں کی بندش کا سلسلہ جاری رہا تو عالمی امن کے لیے شدید خطرہ پیدا ہوسکتا ہے اور اس کے نتیجے میں کوئی بڑی جنگ بھی چھڑ سکتی ہے۔ انیسویں صدی کے امریکی نیول اسٹریٹجسٹ الفریڈ تھیئر ماہان نے کہا تھا کہ سمندروں کو سب مل کر استعمال کریں تو اچھا ہے تاکہ عالمی امن کے لیے کوئی بڑا خطرہ پیدا نہ ہو۔ یہ تصور ایک صدی تک کامیابی سے روبہ عمل رہا ہے۔

بہت سے ملکوں نے سمندری راستوں کو کنٹرول کرکے اپنے لیے غیر معمولی فوائد کی راہ ہموار کی ہے۔ امریکا نے اپنی پہلی بیرونی جنگ ۱۸۰۱ء میں لڑی تھی جو لیبیا کے حاکم کی طرف سے امریکی تجارتی مال کی ترسیل کو سبوتاژ کیے جانے سے روکنے کے لیے تھی۔ تب لیبیا ایک بڑی بحری قوت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب امریکا تمام اہم سمندری راستوں پر اپنی تجارت کے لیے زیادہ سے زیادہ تحفظ چاہتا ہے اور اس کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے۔ امریکی صدر کا طرزِ فکر و عمل بہت عجیب ہے۔ وہ بار بار اپنی باتوں سے مکر جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ابہام رہ جاتا ہے۔ امریکا کے حلیفوں کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایسے میں کریں تو کیا کریں۔

(مترجم: ابوصباحت)

"Hormuz is not the only weak spot for global trade". ("The Economist.". March 26, 2026)

امریکا آخر چاہتا کیا ہے؟

Stephan Richter and Uwe Bo

ایران، کیوبا اور ویتنام کو امریکا کا فطری اتحادی ہونا چاہیے مگر اِس کے برعکس وہ تو امریکا کے بدترین دشمن بن چکے ہیں۔ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟ اِس معاملے میں تاریخ کا ریکارڈ کھنگالنے کی ضرورت ہے، امریکی قیادت کی سوچ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اِس حقیقت سے انکار تو اب ممکن ہی نہیں کہ امریکا کسی نہ کسی طور اپنی چودھراہٹ قائم رکھنے کے لیے کسی بھی حد سے گزرنے کو تیار ہے۔ وہ بہت سے معاملات کی انتہائی خرابی بھی جانتا ہے مگر اِس کے باوجود خود کو اُن معاملات میں الجھنے سے بچانے کی کوشش نہیں کرتا۔ بہت حد تک امریکی اپروچ اب یہ ہے کہ اگر ہم نہیں کھیل سکتے تو پھر ہم میدان کو بھی اِس قابل نہیں رہنے دیں گے کہ وہاں کوئی اور کھیل سکے۔

ایک صدی کے دوران امریکا نے خود کو انتہائی مضبوط کیا ہے اور اِس کا بھرپور فائدہ بھی بٹورا ہے۔ اُس نے پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران خود کو سلامت رکھا اور جب دوسری جنگِ عظیم ختم ہوئی تب اُسے عالمی سیاست و معیشت پر بھرپور تصرف یقینی بنانے کا موقع ملا۔ یورپ اُس کے ساتھ تھا۔ دونوں عظیم جنگوں نے یورپ کو تباہ تو کیا تھا مگر چونکہ اُس کا نظام سلامت تھا اِس لیے وہ دوبارہ کھڑا ہوگیا۔ یورپ تعلیم، تربیت اور ٹیکنالوجیز میں آگے تھا اِس لیے امریکا کے ساتھ مل کر اُس نے پوری دنیا کو مٹھی میں کیا اور یہ سلسلہ اب کو کہ کمزور ہو چکا ہے مگر ختم نہیں ہوا۔

آیئے، ہم گزشتہ صدی کے وسط کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اُس وقت امریکی اثر و رسوخ کس قدر تھا اور وہ کتنا کھل کر کھیل سکتا تھا اور کھیلتا تھا۔

امریکا نے ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ایسا بہت کچھ کیا تھا جس کے نتائج آج خود امریکا ہی کو نہیں بلکہ پوری دنیا کو بھگتنا پڑ رہے ہیں۔ جو کچھ امریکا نے آٹھ عشروں پہلے کیا تھا اُسے کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اُس کی غلط پالیسیوں نے پوری دنیا کو شدید عدم توازن سے دوچار کر رکھا ہے۔ آج کوئی ایک بھی خطہ پوری طرح مستحکم نہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد سب سے بڑا مسئلہ سلامتی یقینی بنانے کا تھا۔ بہت سے بڑے ملکوں کا مینوفیکچرنگ سیٹ اپ بگڑ چکا تھا۔ اُس کی بحالی بھی ترجیحات میں شامل تھی۔ اگر یہ مسئلہ حل نہ کیا جاتا تو دنیا بھر میں انتہائی خطرناک معاشی بحران پیدا ہوسکتا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم نے عالمی معیشت کو ہلا کر تو رکھ ہی دیا تھا، اگر یورپ اور دیگر خطوں کے بڑے ممالک کی مینوفیکچرنگ مشین ڈھنگ سے کام کرنے کے قابل نہ بنائی جاتی تو معاملات اِتنے بگڑتے کہ پھر انہیں کوئی بھی درست کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوتا۔ ایک طرف تو عالمی سطح پر سلامتی یقینی بنانا تھا اور دوسری طرف اہم خطوں میں امریکا کے لیے قابلِ اعتماد اتحادی تلاش کرنا تھا۔ امریکا جانتا تھا کہ اتحادیوں کے بغیر وہ کچھ بھی نہ کرسکے گا۔

گزشتہ صدی کے وسط میں امریکا نے تین غلط فیصلے کیے جواب یاد آتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اُن فیصلوں سے ایک دنیا تلپٹ ہوکر رہ گئی۔

☆ امریکا نے کیوبا میں ۱۹۵۲ء منتخب صدر کارلوس پرایو سوکاراس کی حکومت کا تختہ الٹنے والی فوجی بغاوت کو قبولیت بخشی۔ یہ بغاوت آرمی چیف فلجینشیو بیٹسٹا کی قیادت میں ہوئی تھی۔ امریکا نے کیوبا میں جمہوریت کی بساط لپیٹے جانے پر مثبت ردِعمل ظاہر کرکے دنیا کو بتادیا کہ اُس کی طرف سے جمہوریت نوازی کے نعرے اور دعوے محض دکھاوا ہیں کیونکہ اُسے اِس بات سے کچھ غرض نہیں کہ کس ملک میں کون سا نظامِ حکومت کام کر رہا ہے۔ اُسے تو بس اپنے مفادات کے تحفظ سے غرض ہے۔

☆ ایران میں جمہوریت قائم ہوئی تو یہ بات امریکا اور برطانیہ دونوں ہی کو پسند نہ آئی اور انہیں بادشاہت کی بحالی کی فکر لاحق ہوئی۔ دونوں نے ایران میں حکومت ہی نہیں بلکہ نظامِ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش تیار کی اور یوں سی آئی اے کی نگرانی میں ۱۹۵۳ء میں منتخب ایرانی وزیرِ اعظم محمد مصدق کی حکومت کی بساط لپیٹ دی گئی۔

☆ ویتنام بھی فرانس کی نوآبادیات میں سے تھا۔ ویتنام کی آزادی یقینی بنانے کے لیے کیے جانے والے جنیوا معاہدے سے بہتر کوئی منصوبہ یا ڈیل سامنے لانے میں

امریکا ناکام رہا۔ جنیوا معاہدے پر اُس نے بھی دستخط کیے تھے۔ اِس کے نتیجے میں ویتنام کے دو ٹکڑے ہوئے، شمالی ویتنام اور جنوبی ویتنام۔

تھوڑی سی توجہ سے کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان تینوں معاملات میں امریکا کی واضح غلطیوں نے معاملات کو اِتنا خراب کر دیا کہ پھر عشروں تک اپنے لیے فطری اتحادی تلاش کرتا رہا۔ آج ہم جہاں کھڑے ہیں وہ مقام امریکی پالیسیوں میں پائی جانے والی خرابیوں کا پیدا کردہ ہے۔

جنوبی امریکا میں فطری اتحادی

جنوبی امریکا کی بہت سی حکومتیں اشتراکیت کی طرف جھکاؤ کی حامل رہی ہیں۔ سوویت یونین کے دور میں یہ حکومتیں چاہتی تھیں کہ خالص اشتراکیت اپنا کر خطے کے عوام کے لیے کم از کم طے شدہ سطح تک خوش حالی یقینی بنائی جائے۔ امریکا نے جنوبی امریکا میں ہر اُس ڈکٹیٹر کا ساتھ دیا جو اشتراکیت کی راہ میں دیوار بن سکتا تھا۔ امریکا دنیا بھر میں لبرل جمہوریت کے فروغ کی بات کرتا رہا ہے مگر جہاں بھی اُس کے مفادات جمہوریت سے خطے میں پڑ رہے ہوں وہاں وہ ڈکٹیٹر شپ کی حمایت کے لیے کُھل کر میدان میں آ جاتا ہے۔ سازشوں کے ذریعے فوجی بغاوتوں کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے تاکہ جمہوریت جڑ نہ پکڑ سکے۔

وسطی امریکا ہو یا جنوبی امریکا، کسی بھی خطے میں امریکا کی کُھلے معاشرے کی کیفیت، لچک، تعقل پسندی اور صنفی مساوات جیسی صفات نہیں پائی جاتی تھیں۔ امریکا نے اِن دونوں خطوں میں اپنی مرضی کی حکومتیں تو قائم کیں یا اُن کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا تاہم کہیں بھی حقیقی جمہوری اور لبرل اقدار کے فروغ کی راہ میں رکاوٹیں بھی کھڑی کیں۔ امریکا جن اقدار کا علم بردار رہا ہے انہی کے فروغ کی راہ بھی روکتا رہا ہے۔

کیوبا مختلف ہے۔ کیوبا کے لیڈر فیڈل کاسٹرو نے امریکی مافیا اور کیوبا کے جاگیرداروں کے گٹھ جوڑ کو کبھی قبول نہ کیا اور جہاں تک ممکن ہو سکا، مزاحمت کی اور امریکا کی اجارہ داری کے لیے ایک بڑے چیلنج میں تبدیل ہوئے۔ گلجینشیو بیٹسٹا کی سربراہی میں قائم ہونے والی مطلق العنان حکومت نے کیوبا کے عوام کو کچل کر رکھ دیا۔

ابتدا میں امریکا کے لیے پسندیدگی

فیڈل کاسٹرو نے اپنے ابتدائی سیاسی دنوں میں امریکا کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا۔ شمالی، وسطی اور جنوبی امریکا میں بیرونی (یورپی) نوآبادیاتی قوتوں کے خلاف بھرپور آواز اٹھانے والا پہلا ملک امریکا تھا۔ امریکا نے نوآبادیاتی نظام ختم کر کے حقیقی جمہوریت پر مبنی نظامِ حکومت لانے اور عوام کو زیادہ سے زیادہ خوش حالی سے ہم کنار کرنے کی سوچ اپنائی تھی۔ یہ سب کچھ فیڈل کاسٹرو کے لیے قابلِ قبول تھا۔

بعد میں جب فیڈل کاسٹرو نے محسوس کیا کہ امریکا جو کچھ کہتا ہے اب اُس پر یقین نہیں رکھتا یعنی اُس کا عمل اُس کے قول کے برعکس ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس سوویت یونین کی طرف جھکنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہ اہلِ وطن کا بھلا چاہتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اشتراکیت کو اپنانے کی صورت میں وہ اہلِ وطن کے لیے ایک خاص اور معقول حد تک خوش حالی ممکن بنانے میں کامیاب ہو سکیں گے تو انہوں نے سوویت یونین سے روابط بڑھائے۔ یہ سب کچھ امریکا کو سبق پڑھانے کے لیے کافی تھا مگر فیڈل کاسٹرو کو اِس کی چنداں پروا نہ تھی۔

امریکا نے تمام عالمی امور پر اپنا بھرپور اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لیے اور طاقت میں دن بہ دن اضافے کی خاطر جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ملوث افراد اور گروہوں کے ساتھ بھی مل کر کام کیا ہے۔ امریکی خفیہ اداروں کا ریکارڈ اِس حوالے سے انتہائی شرم ناک ہے۔ امریکی طاقت کا ڈھانچا ہی کچھ ایسا ہے کہ خفیہ اداروں کا کام مشکوک سرگرمیوں میں ملوث گروہوں سے اشتراکِ عمل کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ امریکی قیادت نے ہر دور میں دشمن یا ناپسندیدہ ممالک میں حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لیے جرائم پیشہ گروہوں کا سہارا لیا ہے۔

مسلم دنیا میں بہترین امریکی اتحادی

امریکا نے مسلم دنیا میں حقیقی دوست اور اتحادی تلاش کرنے کے بجائے ایسے ممالک کو منتخب کیا ہے جو اپنے لوگوں کے بھی سچے ہمدرد اور بہی خواہ نہیں۔ امریکا نے مسلم دنیا میں تعلقات بہتر بنانے کے حوالے سے ہمیشہ سعودی عرب کو ترجیح دی ہے۔ یہ ترجیح اِس لیے نہیں ہے کہ سعودی عوام امریکا کو اپنا دوست سمجھتے ہیں بلکہ اِس لیے ہے کہ سعودی حکمراں خاندان امریکی مفادات کی پاس داری کے لیے زیادہ موزوں ثابت ہوتا رہا ہے۔ امریکا کی دوستی عراق یا افغانستان سے بھی مثالی نوعیت کی نہیں رہی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اِن دونوں ملکوں کا سَر جھکانے کے حوالے سے طاقت کے استعمال میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

امریکا نے ایران کے معاملے میں ایک اور فاش غلطی ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کی جب اُس نے شاہ رضا پہلوی کی حکومت کی مکمل حمایت کی اور اُس کے جابرانہ اندازِ حکمرانی کا بھرپور ساتھ دیا۔ ایرانی عوام خوش حال تو تھے مگر معاملات عدل پر مبنی نہیں تھے۔ سب کچھ ایرانی شہنشاہ کی مرضی کے تابع تھا۔ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا تھا کر گزرتا تھا اور اِس معاملے میں عوام کے جذبات اور حقوق کی چنداں پروا نہ کرتا تھا۔ ایرانی حکمران نے امریکا اور یورپ کی حمایت اور تائید سے اپنے عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرف زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ ایران میں تیل کی دولت کی بدولت خوش حالی ضرور تھی مگر عوام کے دل مطمئن نہ تھے۔ جمہوریت کو ایرانی عوام کچھ زیادہ پسند نہ کرتے تھے مگر پھر بھی انہوں نے شاہ رضا پہلوی کی بادشاہت پر جمہوریت کو ترجیح دی اور اُس کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔

ایرانی عوام نے بھرپور جوش و خروش کے ساتھ اور اچھی خاصی قربانیاں دے کر شاہ رضا پہلوی کا تختہ الٹ دیا اور ملاؤں کو ایوانِ اقتدار میں لے آئے۔ عوام کو یقین تھا کہ اب وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں گے تاہم ایسا نہ ہو سکا۔ امریکا نے شاہ رضا پہلوی کے دور کی سفاکی کا بھی اعتراف نہ کیا تھا اور اب ملاؤں کے جبر کو بھی اُس نے قبول نہ کیا۔ ایرانی قوم کا مجموعی مزاج جمہوریت سے بہت دور رہا ہے۔

ایرانی معاشرہ مزاج اور ذہنی سطح کے حوالے سے غیر معمولی حد تک منقسم رہا ہے۔ ایرانیوں کی بڑی تعداد اچھی طرح تعلیم یافتہ ہے۔ شہری تمدن کے تقاضوں کو وہ خوب سمجھتے ہیں اور بالخصوص ایرانی خواتین مہذب زندگی کے تقاضوں کو زیادہ سمجھتی ہیں۔ امریکا کی طرح ایران میں بھی سیکیولر ذہنیت کے حامل افراد کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ یہ لوگ امریکی انداز کی ترجیحات اور مشق پر یقین رکھتے ہیں۔

اگر امریکا نے رضا شاہ پہلوی کی بادشاہت کے جواب میں سیکیولر اور جمہوری اقدار کی حوصلہ افزائی کی ہوتی تو آج معاملات بہت مختلف ہوتے۔ ایرانی قوم نے مذہبی انتہا پسند یا رجعت پسندوں کو بحالتِ مجبوری منتخب کیا اور اُن کے دامن سے وابستہ ہونے کو ترجیح دی۔ اگر امریکا اور یورپ نے مل کر ایرانی عوام کا ساتھ دیا ہوتا اور اُن کا بھلا سوچا ہوتا تو آج ایران کی ایسی حالت نہ ہوتی۔ یہ امریکی پالیسیوں کا کمال ہے کہ آج ایران مغربی معاشروں کی بنیادی سیاسی، اخلاقی اور علمی اقدار سے بہت دور کھڑا ہے۔

محمد مصدق کی حکومت آخر کیوں ختم کی گئی؟ اِس سوال کا جواب تلاش کرنا لازم ہے کیونکہ اِس کے بغیر ہم ایرانی معاشرے میں پیدا ہونے والی شکست و ریخت کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل کبھی نہ ہو سکیں گے۔ بات اِتنی سی ہے کہ محمد

مصدق چاہتے تھے کہ تیل کی برآمد سے حاصل ہونے والی آمدنی سے عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے پر توجہ دی جائے۔ اِس کے لیے لازم تھا کہ تمام دولت شاہی خاندان کے تصرف میں نہ ہو بلکہ جمہوری یا منتخب حکومت کو فنڈ ز دیے جائیں۔ یہ بات رضا شاہ پہلوی کو کسی طور گوارا نہ تھی۔ اِس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ محمد مصدق کی حکومت کی بساط لپیٹ کر تمام معاملات شاہی خاندان کے سپرد کر دیے گئے اور عوام مکمل طور پر شاہی خاندان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے لگے۔

ایرانی عوام اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کے حقوق پر مغرب کی آئل کمپنیز نے ڈاکا ڈالا ہے اور ایرانی حکومت کو اُس کا جائز حصہ نہیں دے رہے۔ اُن میں غصہ پروان چڑھتا رہا اور جب ۱۹۷۹ میں آیت اللہ خمینی نے فرانس سے آکر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا تب ایرانی عوام نے اُن کی قیادت میں ہمہ گیر نوعیت کا انقلاب برپا کیا۔

یہ الگ بات کہ ایرانی عوام کا مقدر پھر بھی نہ بدلا۔ خمینی اور اُن کے ساتھیوں کی قیادت میں جب ایران میں انقلاب برپا ہوا تو ملائیت پر مبنی طرزِ حکومت قائم ہوئی۔ یہ حکومت رفتہ رفتہ جابرانہ ہوتی گئی۔ قومی وسائل پر عوام سے زیادہ ملاؤں کا تصرف قائم ہوا اور پھر سب کچھ اُن کی مرضی کے مطابق ہوتا ہو گیا۔

ایشیا میں فطری اتحادی

امریکا کو ایشیا میں بھی ایک فطری اتحادی درکار تھا۔ ویتنام اِس معیار پر پورا اتر سکتا تھا مگر امریکیوں نے ویتنام کو سمجھنے میں غلطی کی اور ایک ایسی جنگ شروع ہوئی جس نے ایک طرف ویتنام کو برباد کیا اور دوسری طرف امریکا کے لیے بھی انتہائی نوعیت کی مشکلات پیدا کیں۔ ویتنامی معاشرہ امریکی اقدار کا بہت حد تک حامل اور حامی تھا۔ پھر ایسی کیا بات ہوئی کہ امریکا نے اپنے اِس ممکنہ بہترین ایشیائی اتحادی ہی کی پیٹھ میں چُھرا گھونپ دیا۔ امریکیوں نے ویتنام کے انقلابی لیڈر ہو چی منہ کو سمجھنے میں فاش غلطی کی۔ اُن کا خیال تھا کہ تھوڑا سا دھما کر اور تھوڑا سا لالچ دے کر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا جاسکتا ہے۔ امریکیوں نے یہ تو دیکھا کہ ویتنام ایک متحرک معاشرہ ہے، بہت کچھ ہو رہا ہے، معاشی معاملات بہت اچھے چل رہے ہیں، لوگوں میں بہت جوش و خروش پایا جاتا ہے مگر یہ نکتہ سمجھنے میں بہت حد تک ناکام رہے کہ ویتنام نے بیرونی تسلط کے خلاف ہر دور میں غیر معمولی سطح کی مزاحمت کی ہے۔ ہو چی منہ نے جتنا اشتراکیت کے سب سے بڑے مفکر کارل مارکس سے سیکھا تقریباً اُتنا ہی امریکا کے بانیوں سے بھی سیکھا۔

تب سرد جنگ کا زمانہ تھا۔ سوویت یونین کی شکل میں امریکا کے لیے ایک بڑا حریف موجود تھا۔ ویتنام پر سے فرانس کا قبضہ ختم کرانے کے لیے ہونے والے جنیوا معاہدے میں امریکا بھی فریق بنا مگر اپنا کردار پوری دیانت اور عمدگی سے ادا نہ کر سکا اور اِس کے نتیجے میں معاملات بگڑتے ہی چلے گئے۔

ویتنام میں جب ایک جابرانہ حکومت قائم ہوئی تو اُس وقت کے امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے اُس کی حمایت اور مدد کے لیے فوجی مشیر بھیجے۔ اِس کے بعد صدر لنڈن بی جانسن پر بھی شدید دباؤ پڑا کہ وہ ویتنام میں امریکی فوج کی بھرپور موجودگی یقینی بنائیں اور وہاں امریکا مخالف عناصر کو کچلیں۔

رچرڈ نکسن کے عہدِ صدارت میں ویتنام میں امریکی فوج کی موجودگی بہت زیادہ اور نمایاں ہوئی اور اُس کے آپریشنز بھی بہت زیادہ ہو گئے۔ معاملات جب بہت بگڑے تو امریکا کے لیے لازم ہو گیا کہ کسی نہ کسی طور وہاں سے نکلے، جان چھڑائے۔ ۱۹۷۳ء میں پیرس امن معاہدے کے تحت امریکا نے ویتنام سے بوریا بستر لپیٹا۔ یہ خاصی ہزیمت والا معاملہ تھا۔

کسی بھی ملک یا ممالک سے اتحاد قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اِس کے لیے بہت سوچ بچار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رکھنا پڑتا ہے کہ اختلافات سر اٹھاتے رہیں گے۔ سوال اختلافات کو ابھرنے سے روکنے کا نہیں بلکہ اختلافات کو ایک حد تک رکھنے اور معاملات کو چلاتے رہنے کا ہے۔

امریکا نے زیادہ سے زیادہ طاقت کے حصول کی کوشش میں اپنے بانیوں کے طے کردہ اصولوں سے بھی روگردانی کی ہے۔ ایک طرف وہ تو دنیا کو آزادی، جمہوریت اور مساوات کا درس دیتا رہا ہے اور دوسری طرف اُس نے کمزور ممالک اور خطوں کو دبوچ کر رکھنے کی پالیسی اپنائی ہے اور اِس معاملے میں یورپ نے ہمیشہ اُس کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ اب امریکا یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ بعض معاملات میں انتہائی غلط سوچ اپنائی گئی اور حکمتِ عملی بھی بالکل غلط تھی۔

اگر امریکا کیوبا، ایران اور ویتنام سے دوستی کرتا، انہیں ساتھی بناتا، خوش رکھتا تو اُس کے مفادات کی تکمیل زیادہ تیزی سے اور اچھی طرح ہوتی۔ ایسا نہ ہو سکا اور یہ تینوں ممالک امریکا کے ہاتھ سے نکل گئے۔ طاقت کے استعمال کے لیے ذریعے اِنھیں کبھی جھکایا نہ جاسکا۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اب کیوبا پر بھی حملوں کا انتباہ دیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو معاملات بہت زیادہ بگڑیں گے۔ کیوبا میں قائم حکومت سے کھلواڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اچھا ہے کہ امریکا کیوبا کے معاملات میں مداخلت سے گریز کرے۔ اِس وقت امریکی حکومت بیرونی معاملات میں مداخلت کی راہ پر گامزن ہے اور حملے بھی کر رہی ہے۔ ایسے میں کیوبا پر حملے خارج از امکان نہیں۔

امریکی قیادت چاہتی ہے کہ کیوبا میں حکومت تبدیل کر دی جائے۔ یہ اقدام انتہائی نامناسب ہوگا کیونکہ اِس کے نتیجے میں بہت زیادہ خرابی پیدا ہوگی۔ اگر امریکا ایسا کچھ کرتا بھی ہے تو اِس بات کو یقینی بنایا جائے کہ سابق جابر حکمرانوں کی اولاد کو حکومت نہ سونپی جائے۔ پہلے بھی اِس غلطی کے نتیجے میں فیڈل کاسترو جیسا لیڈر ابھرا تھا جس نے امریکا کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔

اگر امریکی قیادت ایران میں حکومت کی تبدیلی کی خواہاں ہے تو اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ سابق بادشاہ رضا شاہ پہلوی کے بیٹے کو اقتدار سونپنا بہت بڑی غلطی سمجھا جائے گا۔ ایرانی ایسی کسی بھی حکومت کو قبول نہیں کریں گے۔ ایران کو استحکام کی ضرورت ہے۔ وہ امن چاہتا ہے تاکہ معیشت کو مضبوط کر سکے، بکھرے ہوئے معاشرے کو مستحکم اور منظم کر سکے۔

ویتنام کو بھی تبدیل کرنے کے بجائے برابری کی بنیاد پر ٹریڈنگ پارٹنر بنانے کی ضرورت ہے۔ ٹیرف کی رکاوٹیں ہٹائی جانی چاہئیں۔ ویتنامی قوم محنتی بھی ہے اور باصلاحیت بھی۔ ایسے میں لازم ہے کہ براہِ راست سرمایہ کاری کے ذریعے اُسے اپنا بنایا جائے۔ (مترجم: ابو صباحت)

"U.S. global strategy: A record of turning natural allies into enemies?" ("The Globalist". March 16, 2026)

بقیہ: آبنائے ہرمز کھلوانے کی جنگ کیسی ہوگی؟

آبنائے ہرمز کی جغرافیائی صورتِ حال بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔ یہ اپنے تنگ ترین مقام پر صرف ۵۰ کلومیٹر چوڑی ہے اور پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے جس کے باعث امریکی جہازوں کے پاس آنے والے حملوں کا پتا لگانے اور جواب دینے کے لیے بہت کم وقت ہوگا۔

اس کے علاوہ تیز سمندری لہروں میں جہازوں کو چلانا بھی ایک مشکل کام ہوگا اور یہ سب اس صورت میں ممکن ہوگا جب تجارتی جہاز اس خطرناک راستے سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔

ماہرین کے مطابق امریکا کو یمن میں حوثی گروپ کے خلاف کارروائیوں سے کچھ تجربہ ضرور حاصل ہوا ہے مگر ایران کے ہتھیار زیادہ جدید ہیں اور اس کا عزم بھی زیادہ مضبوط ہو سکتا ہے کیونکہ وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ایران نے دہائیوں تک اس صورتِ حال کے لیے تیاری کی ہے۔ (مترجم: بن فاروق)

"What a battle to reopen the Strait of Hormuz would look like." ("Economist". Mar 28, 2026)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950